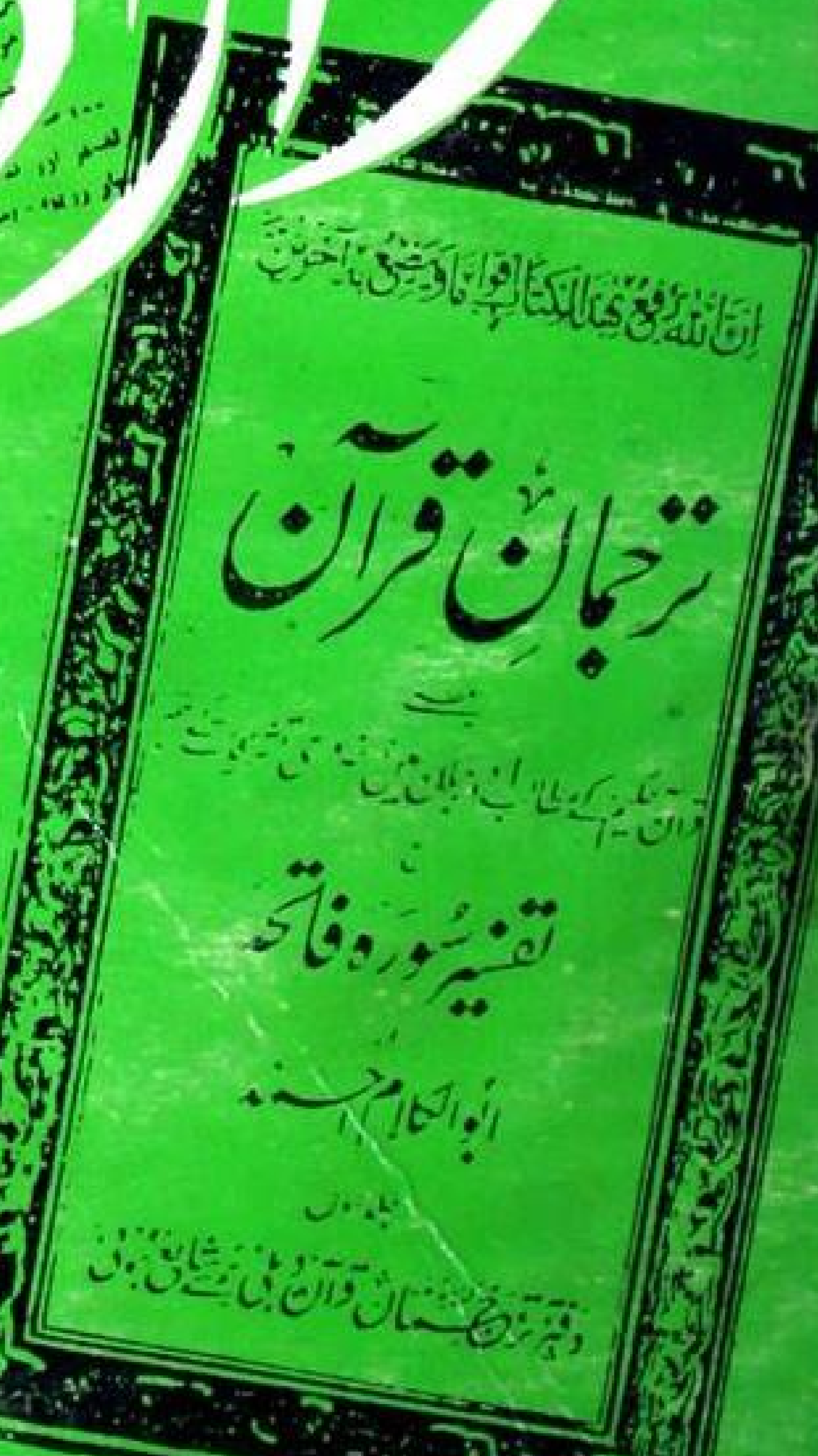
ابوالکلام آزاد

مؤلفہ۔ ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری

(بہ حیثیت مفسر و محدث)

البیان فی مقاصد القرآن

البیان



مولانا ابوالکلام آزادؒ

(بہ حیثیت مفسر و محدث)

اردو کے منفرد ادیب مرزا ظفر الحسن مرحوم کی یاد میں
یہ کتاب کتب خانہ ادارۂ ادبیات اردو
حیدرآباد دکن کو پیش کی جاتی ہے

مجلس ادبیات مشرق
۷ ڈی - ۹/۲۶ - ناظم آباد - کراچی

ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوری

ادارہ
تصنیف و تحقیق
پاکستان
۱۸۰۸۶ کراچی ۳۲

کتاب : مولانا ابوالکلام آزاد
(بہ حیثیت مفسر و محدث)
مولف : ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری
اشاعت اوّل : ۲۲ فروری ۱۹۸۴ء
قیمت : بیس روپے

ملنے کے پتے

(۱)
مکتبہ شاہد
علی گڑھ کالونی۔ کراچی ۴۱

(۲)
پاک اکیڈمی بک سیلرز، پبلیشرز
۲۲ جامع مسجد باب الاسلام۔ آرام باغ کراچی

طابع
المخزن پرنٹرز (مکتبہ رشیدیہ)
پاکستان چوک، کراچی

ناشر
ادارہ تصنیف و تحقیق پاکستان
۱۸۰۸۶۔ کراچی ۲۲

فہرست

۱

۲

انتساب

مخدومی

حکیم محمد سعید دہلوی

کے نام

جن کی شخصیت، فن اور روایت مجھے عزیز ہے

ابو سلمان شاہجہانپوری

روش صدیقی

امام الہندؒ کی یاد میں

کون یہ آخرِ شب بزمِ سحر سے اُٹھا
نالۂ درد، دلِ اہلِ خبر سے اُٹھا

ہائے کس وقت بجھی، شمعِ نہاں خانۂ عشق
شعلۂ غم نفسِ بادِ سحر سے اُٹھا

کون ہے محرمِ اسرارِ مشیت لیکن
اعتبار آج دعاؤں کا اثر سے اُٹھا

ہو گئے قافلۂ اشکِ رواں میں شامل
بارِ اندوہ نہ جب لعل و گہر سے اُٹھا

عظمتِ منبر و محراب جھکی جاتی ہے
کون خلوت کدۂ فکر و نظر سے اُٹھا

تا فلک سلسلۂ حزن و الم جاری ہے
جس طرف آنکھ اُٹھی درد اُدھر سے اُٹھا

سُن لیا جب کہ جدائی ہے یہاں شرطِ وصال
حشر خود اشک بداماں ترے در سے اُٹھا

علم ہے شاہدِ پنہاں کا حجابِ اکبر
ہاں یہ پردہ بھی ترے حسنِ نظر سے اُٹھا

مہ و خورشید نے آنکھوں سے لگایا اس کو
کوئی ذرہ جو تیری راہ گذر سے اُٹھا

تو نے تمکینِ خرد، ذوقِ جنوں کو بخشی
ایک الزامِ کہن، عشق کے سر سے اُٹھا

مرگ سے راز کھلا تیری دل آرائی کا
اک نیا دور ہے یہ تیری مسیحائی کا

إنّ الله يرفع بهذا الكتاب أقواماً ويضع به آخرين

(مسلم عن عمر)

ترجمانِ قرآن

یعنی

قرآنِ حکیم کے مطالب اُردو زبان میں ضروری تشریحات کے ساتھ

مع

تفسیرِ سورۂ فاتحہ

از

ابوالکلام احمد

جلد اول

دفترِ ترجمانُ القرآن دہلی سے شائع ہوئی

اشاعت اول کا صفحہ اول

پیش لفظ

۱

اُردو میں قرآن حکیم کے ترجموں اور مختصر و مفصل تفسیروں کی تعداد کئی سیکڑوں سے متجاوز ہے قرآن کے مترجمیں میں مسلمان ہی نہیں غیر مسلم بھی شامل ہیں تفسیر لکھنے والوں میں بھی مختلف مذاہب و فرق سے تعلق رکھنے والے ہیں۔ جہاں تک ترجموں کا تعلق ہے تو یہ نثر ہی میں نہیں نظم میں بھی ہیں۔ اس لحاظ سے بھی فرق و امتیاز کو ذہن میں رکھنا چاہیے کہ ترجمہ و تفسیر میں ہر مترجم اور مفسر ایک مختلف مقصد کو لے کر اٹھا تھا اور ہر کسی کے ذوق اور عقیدے نے ایک نئے میدان اور مسلکِ تفسیر کی طرف اس کی رہنمائی کی تھی

تراجم و تفاسیر میں یہ اختلاف و تنوع اگرچہ ہر لحاظ سے پسندیدہ نہ تھا۔ لیکن مسلمانوں اور غیر مسلمانوں میں مختلف ذہن و فکر اور ذوق و رجحان کے لوگوں کی تعلیم و تربیت و اصلاح اور تبلیغ کی ضرورت بھی تھی۔ پھر حالات اور زمانے میں تیز رفتار تغیر کا نتیجہ تھا اور اس صدی میں تو ہر ۱۵ ۲۰۰ برس میں تحقیقات و انکشافات علم و سائنس کی بدولت نہ صرف علوم و افکار میں بلکہ اندازِ فکر اور نقطۂ نظر میں ایسا انقلاب رونما ہو جاتا ہے کہ قرآن کے ایک نئے ترجمے اور فوائد کی تالیف اور تفسیر کی ضرورت پیش آجاتی ہے اس کا ایک ناگزیر سبب ذریعۂ ابلاغ (زبان) میں عہد بہ عہد ارتقاء کا عمل ہوتا ہے۔ بایں سبب ایک نئے ترجمے کی تالیف اور قدیم تفسیر میں اصلاح و ترمیم ناگزیر ہو جاتی ہے اور طرز و اسلوب تالیف و نگارش میں خوب سے خوب تر کی جستجو بھی کلکِ تحریر کو ہمیشہ رواں رکھتی ہے

آپ درس و تعلیم قرآن کے ایک ہی سر چشمے سے نکلنے والی علوم و معارف قرآنی کی دو سلسبیلوں کی سیرابیوں اور ان کی بہار آفرینیوں پر نظر ڈال لیجیے، دونوں کا رشتہ اپنے سر چشمے سے ایک لمحے کے لیے بھی نہیں ٹوٹا لیکن اپنے رنگ و ذائقہ اور کیف و اثر میں دونوں ایک دوسری سے مختلف ہیں۔ آپ چاہیں تو ایک ہی سلسبیل کی عہد بہ عہد بہار آفرینیوں اور ایک ہی چمن زارِ تفسیر میں بہنے والی کوثر و تسنیم کی حلاوتوں اور لذت خیزیوں کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ آپ بہ یک دفعہ محسوس فرمالیں گے اور قلب اس کی گواہی دے گا کہ ہر ترجمے میں حکمت و موعظت کے کیف و کم کا پیمانہ جدا اور ہر تفسیر کی ایمان افروزی اور قلب کو سکون بخشی کا عالم مختلف ہے۔ لیکن کیا ضروری ہے کہ بات تشبیہ و استعارہ میں کی جائے برصغیر میں درس و تعلیم قرآن کا اولین سرچشمہ امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کی ذات گرامی اور ان کا مدرسہ رحیمیہ تھا اور علوم و معارف قرآنی کی دو سلسبیلوں سے مراد علمائے حق کے وہ دو سلسلے ہیں جو دیوبند کے اہل سنت اور دہلی کے اہل حدیث (اور ان کے سلسلے) کے ناموں سے یاد کیے جاتے ہیں اور چمن زارِ تراجم و تفاسیر میں بہنے والی کوثر و تسنیم کی نہروں اور ان کی بہار آفرینیوں اور لذت اندوزیوں سے اشارہ ان دونوں سلسلوں کے خصائص تراجم و تفسیر کی طرف ہے۔ اور پھر ہر سلسلے میں حکمت و موعظت قرآنی کے کیف و کم کا اندازہ کرنا ہو تو ایک طرف شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالقادر سے بواسطہ شیخ الہند مولانا محمود حسن، مولانا عبیداللہ سندھی اور شیخ التفسیر مولانا احمد علی لاہوری تک اس سلسلے کے مختلف تراجم و تفاسیر پر ایک حقیقت شناس نظر ڈالیے، دوسری طرف حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کے خاندان رفیع الارکان کے افادات سے بہ واسطہ نواب محمد صدیق حسن خاں و مولانا ثناء اللہ امرتسری سے مولانا محمد عبدہٗ تک، اس دوسری جماعت حقہ اور خدمت گزاران قرآن و علوم و معارف الٰہیہ کی خدماتِ جلیلہ کو دیکھیے آپ کے سامنے فیضانِ الٰہیہ کا ایک نیا جہان نمودار ہو جائے گا اور قلب سلیم قرآنی بصائر و حکم کی نئی لذتوں سے آشنا ہو گا۔

یہ خصائصِ کیف و کم اور لذت بیش و کم، جن کی طرف اہل سنت اور اہل حدیث کے حوالے سے اشارہ کیا، اگر آپ چاہیں تو اس میں کسی اور مکتبہ فکر کو بھی شامل کر لیجیے۔ بہر حال اگر یہ اندازِ حکمت و موعظت، طرز تعلیم و تبلیغ، طریق پند و نصیحت، معیار تالیف و تصنیف اور اسلوب زبان و بیان اردو میں ایک ہی ہوتا اور دہی تمام زبانوں کے لیے یکساں مفید ہوتا تو ہر دور اور ہر زمانے میں ایک

نیا ترجمہ کرنے اور نئی تفسیر لکھنے کی ضرورت ہی پیش کیوں آتی۔ پس جس طرح ہر دور میں نئے ترجمے اور تفسیر کی ضرورت پیش آتی رہی اسی طرح ان میں اختلاف بھی ناگزیر ٹھیرا۔ لیکن اگر اختلاف ناگزیر تھا تو اختلاف کے لیے کسی حد کے تعین کی ضرورت بھی اتنی ہی ضروری تھی تاکہ کوئی مترجم اور مفسر اپنی جولانی طبع اور جوشِ تحریر میں حد سے آگے نہ نکل جاتے اور اگر اختلافِ ذوق ورجحان اور فکر و اندازِ فکر ذاتی کے مطابق ترجمہ و تفسیر کی اجازت تھی تو اس جواز کے لیے بھی کوئی پابندی لازم تھی، تاکہ کوئی شخص قرآن کو اپنی ذاتی فکر و رائے کا بازیچہ نہ بنا دے۔

افسوس کہ خطرہ حقیقت بن گیا۔ کتنے ہی مفسرین نے ان بہترین اصول تفسیر کو قطعاً پروانہ کی جو ان کی رہنمائی کے لیے موجود تھے۔ اصول و فن کے تقاضوں پر ذوق غالب آگیا۔ ہر کسی کی جولانی طبع نے کرشمہ دکھایا اور انیسویں صدی کے ہندو پاکستان میں پیدا ہونے والے مکاتب فکر اور فرق و مذاہب کے ذوق و انہماک نے تعلیمات الٰہی کو انسانی دماغ سوزیوں اور فکر پیمائیوں کی جولان گاہ بنا دیا۔ ہر کسی نے اپنے ذوق و عقائد کے مطابق ترجمہ یا تفسیر کی۔ کسی کے ذوق نے غیر مقلدوں کے ایراد پر آمادہ کیا، کسی کے ذوق نے تقلید کے رد کی طرف توجہ دلائی۔ کسی کا ہدف دیوبندی اور اہل حدیث دونوں بنے اُن کی نظر میں ان کے محاسن بھی معائب قرار پائے۔ کوئی تصوف کا ذوق و انہماک رکھتا تھا، اس نے اپنی تفسیر کو سلوک و تصوف کے شطحیات کا مجموعہ بنا دیا، کوئی تشکیک والحاد کی راہوں سے گزر کر یقین و ایمان کے مقام تک پہنچا تھا، اس کے نزدیک سب سے اہم اور ضروری نکتۂ تفسیر یہ بنا کہ اسباب تشکیک اور سرچشمہ الحاد کو دفع کرے، کسی کا ذہن سائنسی افکار اور ایجادات و اختراعات سے متاثر تھا، اس نے قرآن کی آیات سے اسی کے اثبات کو وقت کی سب سے بڑی ضرورت، فن کی سب سے بڑی خدمت اور تفسیر کی سب سے بڑی خصوصیت سمجھا۔ کوئی جھاڑ پھونک اور ٹونوں ٹوٹکوں کی اثر آفرینی کا قائل تھا اس نے ہر قسم کی آفات و بلیات کے دفعیہ اور انسداد کے لیے قرآن کی آیات و سُوَر کے خصائص متعین کیے۔ سورتوں کے اعداد نکال کر ان کے تعویذ بنائے گئے، تعبیرات خواب کا قرآن سے کام لیا گیا، مستقبل کے حالات، ساعاتِ سعد و نحس کی جستجو، قسمت کا حال، اعمال بلکہ بے عملیوں کے نتائج معلوم کرنے کے لیے دیوان حافظ کی طرح فالنامے مرتب کیے گئے۔ بعض مفسرین نے قرآن کی حکمت و موعظت کو قصص و حکایات کا مجموعہ بنا دیا اور کوئی ایسی روایت نہ تھی جسے تفسیر قرآن کے چوکھٹے میں فٹ نہ کر دیا ہو۔ کسی

کو قرآن کی فصاحت و بلاغت نے متاثر کیا تھا اس نے اردو ترجمہ میں محاورات و امثال کے استعمال سے عربی فصاحت و بلاغت کا رنگ دکھانا چاہا کسی کو قرآن کے منتشر مضامین میں رنگا رنگ پھولوں کے گلدستے کا سا حسن و اتحاد نظر آیا۔ اس نے اپنے کمالِ نطق و بیان سے مضامین قرآن کے انتشار میں وہی حسن و اتحاد سب کو دکھانا چاہا۔ کسی نے شاعرانہ اسلوب بیان کی جستجو میں قرآن کے حسن بیان میں نکتہ آفرینی کی۔ کسی کو حروف مقطعات کی جامعیت میں قرآن کی عظمت کا راز نظر آیا۔ ایسے بھی تھے جنھوں نے اپنے ذاتی افکار و آرا کے مطابق قرآن کو ایک بازیچہ بنا دینے کی کوشش کی اور اپنی آرا کے اثبات کے لیے ہر قسم کی اسرائیلیات، روایات موضوعہ اور قصص و حکایات سے کام لیا۔ اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بعض محتاط اصحاب علم و نظر نے سلف کی تشریحات کے مطابق تفسیر بیان کر دینا اور اس میں نہ کچھ کم کرنا اور نہ کچھ زیادہ کرنا اپنی ذمہ داری سمجھا۔

قرآن ایک ہی تھا، سب اسے ماننے کے دعویدار تھے لیکن شیعوں، سنیوں، حدیث کے منکروں، حدیث کے ماننے والوں، اہل قرآن ہونے کے مدعیوں، حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور خاتم النبیین پر ایمان رکھنے والوں، آپؐ کو خاتم النبیین نہ ماننے والوں، خلافت راشدہ کے عہد میں سعادت اور اس کی ترتیب کو من جانب اللہ اور بہ ایماو اشارۂ نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام یقین کرنے والوں اور اس پر بالکل ایمان نہ رکھنے والوں۔ اسلام کو ایک تحریک سمجھنے والوں اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لیے ایک جماعت کی ضرورت پہ عقیدہ رکھنے والوں اور جماعت کی تعلیم و تربیت کے لیے قرآن کو ایک نصابی کتاب یقین کرنے والوں اور انقلاب اقوام و ملل کے عزائم رکھنے والوں، فقہ و منطق اور اصول و کلام کا ذوق رکھنے والوں غرضیکہ ہر شخص، ہر فرقے اور جماعت نے اپنے اپنے ذوق و فکر اور دعاوی و عقائد کے اثبات کا قرآن سے کام لیا اور اپنے زعم میں براہین قرآنیہ اور دلائل بدیہہ سے اپنے ذوق و فکر اور مسلک و مذہب کو حق ثابت کر دیا اور ایسے ایسے نکتے پیدا کیے کہ معلوم ہوتا ہے۔ قرآن کا مقصدِ نزول اگر کوئی تھا تو صرف یہی تھا اور اگر اس میں جامعیت کی کوئی خوبی ہے تو یہی کہ دنیا کے تمام متضاد و متباین افکار و نظریات اور فرق و مذاہب کے دعاوی کو اس سے ثابت کر دیا جا سکتا ہے۔

بلاشبہ بعض کوششیں نہایت قابل قدر ہیں اور بعض کوششوں میں کچھ ایسی خوبیاں ہیں جن کی وجہ سے ہم انھیں دیکھنے سے باز نہیں رہ سکتے لیکن سوال بعض قابل قدر کوششوں اور بعض خوبیوں

کا نہیں، سوال یہ ہے کہ اُردو میں تراجم کی صورت میں اور تفاسیر کے نام پر جو کچھ ہے، کیا قرآن کا مقصدِ نزول یہی تھا؟

قرآن حکیم کسی خاص علم و فن کی کتاب نہ تھی، وہ کسی خاص قوم کے حقوق کا معلّن تھا، نہ کسی خاص فرقے کے عقائد کے، نہ کسی گروہ کے رسوم و روایات کے اثبات کے لیے نازل ہوا تھا۔ قرآن اللہ کی آخری کتاب ہے جو اس نے انسانوں کی ہدایت کے لیے نازل فرمائی ہے۔ ہدایت کی ضرورت ظاہر و باطن، فکر و عمل، انفراد و اجتماع میں ہر جگہ تھی۔ اس کی اولین مخاطب خلقتِ انسانی تھی۔ مسلم اور کافر کی اصطلاحیں بعد میں پیدا ہوئیں۔ جو ایمان لے آتے ان کی خاص تعلیم اور تربیت و اصلاح کی ضرورت پیش آئی۔ صاحبؐ قرآن کے سامنے خارجی تبلیغ اور داخلی اصلاح و تربیت کے دو میدان تھے۔ ہدایتِ الٰہی نے تبلیغ کے میدان میں بھی رہنمائی کی اور داخلی میدان میں تعلیم و تزکیہ کا سرو سامان بھی فراہم کیا۔

جب ہم انسانی زندگی پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں زندگی مختلف دائروں میں بٹی ہوئی اور چھوٹے بڑے اجتماعوں میں منقسم نظر آتی ہے۔ یہ دائرے اور اجتماع ایک دوسرے سے وابستہ و پیوستہ بھی ہیں۔ ہم ان دائروں اور اجتماعوں کو انسانی زندگی کی مختلف سطحوں سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ یہ دائرے یا سطحیں خاندان، کنبہ، قبیلہ، قوم اور کل انسانی سطح کی صورت میں نمایاں ہوتی ہیں۔ لیکن تمام سطحوں اور اجتماعوں میں بنیادی اہمیت فرد کو حاصل ہوتی ہے۔ اجتماعِ انسانی میں فرد کی حیثیت قلب کی سی ہوتی ہے۔ اور جس طرح انسانی جسم میں قلب کی صحت و سلامتی پر انسان کی پوری فکری و عملی زندگی کی صلاح و فلاح کا دار و مدار ہوتا ہے اسی طرح انسانی زندگی کی ہر اجتماعی سطح کی صحت و سلامتی کا دار و مدار فردِ انسانی کے اصلح و انفع ہونے پر ہوتا ہے۔ اگر کسی سوسائٹی کے افراد صلاحیت کے حامل نہ ہوں تو زندگی کا کوئی اجتماع انسانیت کے لیے خیر اور امن کا موجب نہیں بن سکتا۔ ہر ابتدائی فساد زدہ اجتماع اوپر کی اجتماعی سطح کے لیے خرابی کا باعث ہوتا ہے۔ پھر جب انفراد کی برائیاں اجتماعات میں جگہ پا لیتی ہیں تو سوسائٹی کے صالح افراد بھی جو تعداد میں کم اور حیثیت میں کمزور ہوتے ہیں، ان برائیوں اور فساد کے اثرات سے متاثر ہو جاتے ہیں اور ایسا نقشہ کھنچ جاتا ہے گویا خشکی و تری سے برائیاں پھوٹ پڑی ہیں۔

دنیا میں کوئی مذہب ایسا نہیں جس نے ایک مرتب نظام کے تحت فرد سے لے کر بین الاقوامی سطح تک ہر چھوٹے بڑے انسانی اجتماع کی تعلیم و تربیت کا تمام سرو سامان مہیا کر دیا ہو۔ قرآن ایک عالمگیر

انسانی معاشرہ قائم کرنا چاہتا ہے اس کے لیے وہ ایک نظام فکر رکھتا ہے۔ جب کوئی شخص اس کی دعوت کو قبول کر لیتا ہے تو وہ اسے اپنے نظام تعلیم و تربیت کے حوالے کر دیتا ہے۔ جہاں اس کے ذہن و فکر کی تربیت اور اخلاق و سیرت کی تشکیل کے عمل سے اُسے ایک ایسے فرد کے سانچے میں ڈھال دیا جاتا ہے جو اپنی انفرادی زندگی ہی میں نیک سرشت اور پاک باز نہیں رہتا بلکہ خاندان کا ایک فرض شناس رکن، کنبہ پرور اور انسانی زندگی کے دوسرے اجتماعات کا ذمہ دار فرد بھی ثابت ہوتا ہے اس کا وجود صالح ہی نہیں انفع بھی ہوتا ہے۔ وہ خیر کا سرچشمہ بن جاتا ہے۔ اس کا ذاتی یقین اور اجتماعی فلاح کا احساس اسے معروف کا دلدادہ اور مبلغ ہی نہیں بناتا بلکہ منکر کو وہ ناپسند بھی کرتا ہے اور دوسروں کو بھی اسے اختیار کرنے سے روکتا ہے۔ اس کے خیر کی کوئی انتہا نہیں ہوتی۔ وہ اپنے فکر اور عمل کی پاکیزگیوں سے پوری انسانیت کے لیے ایک مثال بن جاتا ہے۔ ایسا شخص اپنے خاندان کا راعی قوم میں حق کا داعی اور عالم گیر اجتماعیت یا متحدہ انسانیت کے قیام میں ساعی اور کلمۂ سوا پر اتحاد کے لیے سب کو پکارنے والا ہوتا ہے۔

پس اگر یہ صحیح ہے اور اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا تو ایسا ترجمہ اور تفسیر کون سی ہے جس کے مترجم اور مفسر نے اپنے ذوق کی ترجمان کا ذریعہ بنانے کی بجائے، قرآن کی دعوت و تعلیمات اور اس کے مقصدِ نزول کو صرف اسی کے حروف و سواد میں پیش کیا ہو۔ ایسا ترجمہ کون سا ہے جو بیرونی و خارجی تبلیغ اور داخلی اصلاح و تعلیم اور پھر فرد سے لے کر عالم گیر اجتماع انسانی کے قیام تک ہر سطح اور ہر دائرے میں تربیت افراد و اجتماع اور تشکیل انسانیت کا سروسامان اپنے اندر رکھتا ہو۔ ایسا ترجمہ جس کے بارے میں یہ کہا جا سکے کہ یہ ترجمہ کسی خاص فکر، عقیدے، فلسفے یا کسی فرقے یا گروہ کے عالم کا نہیں، صرف قرآن کا ترجمہ ہے بلا شبہ بعض تراجم و تفاسیر کو ان کے خصائص کی بنا پر ایک دوسرے پر ترجیح دی جا سکتی ہے۔ لیکن اگر کسی ایک ہی ترجمے کی نشاندہی ضروری ہو تو اس کے لیے مولانا ابوالکلام آزادؒ کے ترجمان القرآن کے سوا کسی اور پر نظر نہیں ٹھیرتی۔

اس مجموعے کے پہلے حصے میں حضرت مولانا آزاد کی قرآنی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے اور مولانا کے ترجمان القرآن، تفسیر سورۂ فاتحہ اور تفسیری مقالات میں ان کے خصائص کی جستجو کی گئی ہے۔ ان کے مطالعے سے نہ صرف مولانا کے ترجمہ و تفسیر کے محاسن کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ ان کے ذہن و فکر کے کمالات، اندازِ فکر کی خوبیوں اور مطالعہ و نظر کی وسعتوں اور گہرائیوں کا بھی بے روک مشاہدہ ہو جاتا ہے لیکن میرے نزدیک یہی کافی نہیں کہ اس مجموعے کے مقالات کو پڑھ کر مولف و مرتب کی رائے سے اتفاق کر

لیا جائے بلکہ اہم بات یہ ہے کہ مولانا کے ترجمان القرآن کا بالاستیعاب اور گہرا مطالعہ کیا جائے۔ میں اسی کا آرزومند ہوں۔

۲

قرآن اپنے نزول کے وقت ہی آخری ہدایت نہ تھی بلکہ تا قیامِ قیامت اللہ کی دائمی ہدایت ہے۔ اس لیے ضروری تھا کہ اس کی ہدایت کا ایک معیار اور تعلیم کا ایک خاص انداز و اسلوب ہو اور اس کی کلی تفہیم کے لیے کوئی ایسا نمونہ اور معیارِ عمل بھی بتا دیا جائے جو نہ صرف اس کے عہدِ نزول میں بلکہ اس تعلیم کی ابدیت تک ہر زمانے کے لیے احکام و مسائل کے استنباط میں اصول اور ماخذ کا کام دے، نیز بہ لحاظِ جامعیت و کاملیت انسانی سیرت کی شکل میں وہ اللہ کی آخری برہان ہو تاکہ آئندہ ہر انسانی سیرت اسی معیار پر جانچی اور اسی کسوٹی پر پرکھی جائے یہ ہدایت بین الدفتین مسطور اور سوادِ حروف میں محفوظ ہونے کے بجائے مجسم و ناطق اور تعلیماتِ الٰہی کی عملی شکل اور مکمل نمونہ ہو۔ پس جس طرح رحمتِ الٰہی کی کارفرمائی نے فرد کی اصلاح و ہدایت سے لے کر خاندان، کنبے، قوم اور اجتماعِ انسانی کی بین الاقوامی سطح تک ہدایت و فلاحِ انسانی کا سروسامان کر دیا ہے، ضروری تھا کہ وہ اس کے دائمی اصول و معیارِ عمل اور ماخذ کا فیصلہ بھی کر دے اور اس امرِ عظیم کے فیصلے کو انسان کی محدود اور حالات و گرد و پیش سے متاثر ہو جانے والی عقل کے لیے نہ چھوڑ دے۔ چنانچہ رحمتِ الٰہی نے اپنی ربوبیتِ کاملہ سے تعلیماتِ قرآن کا ایک نمونہ بھی تیار کر دیا اور بتا دیا کہ یہ شخصیتِ نبوت تمہارے لیے اسوۂ حسنہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ تعلیماتِ الٰہی کا کامل نمونہ ہے اور جب ارشاداتِ ربانی کی تفہیم و اطلاق اور ان سے اخذ و استنباطِ قانون و مسائل کی ضرورت پیش آئے تو اسوۂ نبوی سے رہنمائی حاصل کرو۔

بس جس طرح عہدِ نبوی میں آپؐ کی ہدایت کے مطابق وحیِ الٰہی کے ایک ایک لفظ کو محفوظ

کر دیا گیا تھا، اسی طرح آپؐ کے بعد کے عہد میں اسوۂ و تعلیمات نبوی کے ایک ایک نقطے اور شوشے کو منضبط و مسطور کر دیا گیا اور اس علم کے ماہروں اور فن کے محققوں نے تحقیق و تعدیل اور نقد و نظر کے ایسے اصول و معیار قائم کر دیے کہ اسوۂ و تعلیمات نبوی کا چشمہ صافی نا آشنایانِ فن کی کاوشوں اور افکارِ عہد بہ عہد کے گرد و غبار کی آلودگی کے خطرے سے ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جائے۔

اس مجموعے کے دوسرے حصے میں اس آشنائے حکمتِ نبوی کے افکار و افادات پر ایک سرسری نظر ڈالی گئی ہے۔ اس سے کئی باتیں اجمال کے باوجود پوری طرح واضح ہو جاتی ہیں۔ مثلاً۔

- اسلامی شریعت میں نیز قانون کے ماخذ کی حیثیت سے حدیث نبوی کی اہمیت کیا ہے!
- نہ صرف علوم اسلامی میں بلکہ دنیا کے علوم و فنون میں اصولِ تحقیق اور معیارِ نقد و نظر کے لحاظ سے علم حدیث کا مقام کیا ہے!
- حدیث کی تحقیق اور فن حدیث کی تدوین میں محدثین اور علمائے محققین کا کارنامہ کتنا عظیم الشان ہے!
- یہ بات بھی پوری طرح نمایاں ہو جاتی ہے کہ حضرت مولانا آزادؒ کے نظام فکر میں حدیث کی حیثیت کیا ہے اور فن حدیث میں ان کی بصیرت اور نظر و تبحر کا عالم کیا ہے!

ابو سلمان شاہجہانپوری
۵-۲-۱۹۸۴ء

بہ حیثیت مفسّر

لکھنے والے :

مولانا سید سلیمان ندوی
مولانا سعید احمد اکبر آبادی
مولانا محمد حنیف ندوی
سید عبداللطیف
ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری

إن الله يرفع بهذا الكتاب أقواماً ويضع به آخرين

ترجمان القرآن

یعنی

قرآنِ حکیم کے مطالب اُردو زبان میں

ضروری تفسیر کے ساتھ

از

ابوالکلام احمد

مکتبہ مصطفائی کشمیری بازار لاہور

ترجمان القرآن جلد دوم اشاعت اول کا پہلا صفحہ

مولانا سید سلیمان ندوی

ترجمان القرآن

واقعات کی رفتار پر جن لوگوں کی نظر ہے، ان کو یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں روز بروز قرآن مجید اور خالص قرآن مجید کی طرف توجہ بڑھتی جاتی ہے اور اس کو سمجھنے اور اس میں غور و فکر کرنے کا میلان ترقی کر رہا ہے۔ مگر ایک طرف اگر قرآن صرف عمل اور نصیحت پذیری کے لیے پڑھا جائے، تو وہ نہایت آسان ہے۔ لیکن دوسری طرف اگر نکتہ آفرینی، اصول فہمی اور استنباطِ مسائل کے لیے پڑھا جائے تو وہ نہایت دقیق و عمیق ہے۔ گو عام مسلمانوں کے لیے صرف پہلی حیثیت سے اس کا پڑھنا اور سمجھنا کافی ہے مگر نکتہ آفرین اور کاوش و تفلسف کے خوگر مسلمان اپنی تسکین و تشفی کے لیے ہر حکم کی گہرائی اور ہر آیت کی تہ تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ مگر ظاہر ہے کہ ؎

یہ منصبِ بلند ملا جس کو مل گیا
ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

آج کل افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ بعض کوتاہ نظر مسلمانوں میں یہ خیال پیدا ہو گیا ہے کہ قرآن حکیم نہ صرف نصیحت پذیری کے لیے بلکہ نکتہ آفرینی اور استنباطِ مسائل کے لیے بھی نہایت آسان ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہر کہ و مہ قرآن کی ہر آیت کے متعلق بکمال جرأت داد تحقیق دینے کے لیے متعد نظر آتا ہے، اور اوراق کی سیاہی میں اپنے دل کی سیاہی کا مظاہرہ کرتا ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ نوجوان مسلمانوں میں قرآن پاک کا ذوق مولانا ابوالکلام کے الہلال و البلاغ نے پیدا کیا۔ اور جس اسلوبِ بلاغت، کمال انشا پردازی اور زورِ تحریر کے ساتھ انہوں نے انگریزی خوان نوجوانوں کے سامنے قرآن پاک کی ہر آیت کو پیش کیا۔ اس نے ان کے لیے ایمان و یقین کے نئے نئے دروازے کھول دیئے، اور ان کے

حوالہ: ابوالکلام آزاد مرتبہ عبداللہ بٹ۔ لاہور، ۱۹۴۳ء

دلوں میں قرآنِ پاک کے معانی و مطالب کی بلندی اور وسعت کو پوری طرح نمایاں کر دیا۔

ضرورت تھی کہ اسی مؤثر قلم سے قرآنِ پاک کی پوری تفسیر شائع ہو، تاکہ عربی سے نابلد مسلمانوں کے لیے نور بینش اور افزایشِ بصیرت کا سروسامان اُردو میں میسّر آئے۔ ۱۹۱۲ء سے شائقین کا اصرار تھا، اور خود مولانا کی بھی خواہش تھی کہ وہ قرآنِ پاک کا ایک ترجمہ اور ایک تفسیر لکھیں اور مجھے یاد آتا ہے کہ ۱۹۱۳ء میں سب سے پہلے مَیں نے ہی مولانا کے سامنے ترجمہ و تفسیر دونوں کے درمیان کی چیز "تفسیری ترجمہ" کی تحریک کی یعنی ایک ایسا مطلب خیز ترجمہ جو گو سراسر لفظی نہ ہو لیکن لفظوں سے الگ بھی نہ ہو۔ اور ساتھ ہی حسب موقع توضیحی و تشریحی الفاظ بھی اُس کے ساتھ ہوں۔ یہ چیز الفاظ و عبارت اور ضخامت اور مولانا کی قلتِ فرصت کے لحاظ سے مختصر اور ممکن بھی تھی، اور شائقین کی بصیرت اور فہم قرآن کے لیے بھی بس کرتی تھی مجھے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نے اس مشورہ کو قبول کیا، اور "تفسیری ترجمہ" کی طرف توجہ کی، لیکن ساتھ ہی ساتھ بڑی تفسیر (البیان) لکھنے کا خیال بھی اُن کے دل سے محو نہیں ہُوا۔ لیکن جنگِ عظیم (۱۹۱۴ء) کے اعلان کے بعد ہی سیاسی دار و گیر کا وہ سلسلہ شروع ہوا، جس نے اُن کے جیسے آزاد کو بارہا گرفتار اور بارہا آزاد کیا۔ اس سلسلۂ قید و حبس میں اُن کے کاغذات و مسوّدات بھی بارہا قید و نظربند ہوئے۔ آخر ان پے درپے حوادث کے بادِ تُند نے ان اَوراق کو پراگندہ اور منتشر کر دیا۔ مصنّف کو جب کبھی جیل کے اندر یا باہر یک سوئی نصیب ہوئی۔ اُس نے اِن اَوراقِ پریشان کو از سرِ نَو مرتّب کرنا چاہا اور عجب نہیں کہ مولانا حالیؔ کا یہ شعر اس وقت ان کی زبان پر ہو ؎

ہم آج بیٹھے ہیں ترتیب دینے دفتر کو
ورق ہی جب کہ اُڑا لے گئی ہوا ایک ایک

بہر حال وہ مبارک وقت آیا کہ مولانا نے اپنے ترجمہ و تفسیر کی پہلی جلد بنام "ترجمان القرآن" مرتب کر کے شائع کی۔ اس جلد میں سورۂ فاتحہ کی پوری مکمل تفسیر اور سورۂ بقرہ و آلِ عمران و نساء و مائدہ و انعام پانچ سورتوں کا (جو آٹھ پاروں پر مشتمل ہے)، تفسیری ترجمہ ہے۔

مسلمانوں نے قرآنِ پاک کی تفسیریں بہت لکھیں اور شاید ایک بھی نہیں لکھی۔ "شاید" اس لیے کہتا ہوں کہ سلف کی تفسیریں ناپید ہیں۔ اس لیے اُن پر حکم لگانا احتیاط کے خلاف ہے۔

بہرحال کتب تفسیر اور علماء کی تفسیری تصنیفات جہاں تک نظر سے گزری ہیں، علامہ ابن تیمیہ اور حافظ ابن قیم اور خاص ادب و اعجاز کے لحاظ سے ابوالفتح عبدالکریم موصلی (مصنف المثل السائر) اور متاخرین میں حضرت شاہ ولی اللہ سے بہتر قرآن کے محقق نگاہ میں نہیں جچے۔

علامہ ابن تیمیہ اور حافظ ابن قیم کی مستقل تفسیریں تو ناپید ہیں، لیکن یوں اُن کی ہر تصنیف قرآن پاک کی تفسیر کا ایک ٹکڑا ہے۔ علاوہ ازیں علامہ ابن تیمیہ کی تفسیر سورۂ اخلاص، معوذتین اور سورۂ نور الگ بھی چھپ گئی ہیں۔ اور حافظ ابن قیم کی اقسام القرآن، مفتاح دارالسعادۃ اور ابھی حال میں بدائع الفوائد چھپ گئی ہے۔ ان کتابوں سے ان بزرگوں کی طرزِ تفسیر کا پتہ بخوبی چلتا ہے۔

بات یہ ہے کہ عموماً تفسیریں دو ہی قسم کی لکھی گئی ہیں، یا محض روایتی و نقلی جیسے ابن جریر طبری، ثعالبی، قرطبی، بغوی، ابن کثیر وغیرہ، یا تمام تر عقلی جیسے تفسیر کبیر، ابومسلم نیشاپوری، راغب اصفہانی، امام رازی، نیشاپوری، مدارک و بیضاوی وغیرہ۔ لیکن ایسی تفسیر جس میں عقل و نقل کی پُر احتیاط آمیزش ہو، اور جس میں اگر روایتیں ہوں، تو وہ بھی روایت و درایت سے پوری اور عقلیات ہوں تو افلاطون اور ارسطو کی پیروی سے آزاد، اگر لکھی گئی تو علمائے اسلام میں یہ سعادت علامہ ابن تیمیہ اور حافظ ابن قیم کے سوا کسی اور کو نصیب نہیں ہوئی۔ علماء روایت پسند ہوئے تو اسرائیلیات کے شکار ہوئے، اور علماء عقلیت پسند ہوئے۔ تو یونانیوں کے مزخرفات کے اسیر و پابند، یہ دو بزرگ اسلام میں ایسے ہیں، جو اگر ایک طرف روایات کے ناقد و مبصر ہیں۔ تو دوسری طرف یونانیات کے نقاد اور ان کے حق و باطل کے واقف کار ہیں، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اُن کے دل ان سب سے ماورا، حکمتِ محمدی کے ذوق چشیدہ، اور اُن کے سینے معارفِ نبوی کے گنجینہ ہیں۔ اُن کی تفسیر تمام تر حکمت و مصلحت اور حقیقت و مغز پر مشتمل ہوتی ہے۔ مگر وہ حکمت نہیں جو یونان کے خم کدہ سے اُچھلی ہو، بلکہ وہ جو حجاز کی نہر کوثر سے بہہ کر نکلی ہو، یا جو فطرتِ انسانی کے ربانی چشموں سے اُبلی ہو۔

مصنف ترجمان القرآن کی یہ دیدہ وری داد کے قابل ہے کہ انہوں نے وقت کی روح کو پہچانا، اور اس فتنۂ فرنگ کے عہد میں اُسی طرز و روش کی پیروی کی جس کو ابن تیمیہ اور ابن قیم نے

فتنۂ تاتار میں پسند کیا تھا، اور جس طرح انہوں نے اُس عہد کے مسلمانوں کی تباہی کا راز فلسفۂ یونان کی دماغی پیروی کو قرار دیا۔ اسی طرح اس عہد کے مسلمانوں کی بربادی کا سبب ترجمان القرآن کے مصنّف نے فلسفۂ یونان و فرنگ کی ذہنی غلامی کو قرار دیا، اور نسخۂ علاج وہی تجویز کیا کہ کلامِ الٰہی کو رسول کی زبان و اصطلاح اور فطرت کی عقل اور فلسفہ سے سمجھنا چاہیے۔

ترجمان القرآن دو حصّوں پر منقسم ہے۔ حصۂ اوّل مصنف کی تفسیر البیان میں سے سورۂ فاتحہ کی تفسیر ہے۔ اور حصۂ دوم سورۂ فاتحہ سے لے کر انعام تک کا تفسیری ترجمہ ہے۔ مصنّف کی دیدہ وری اور نکتہ پژوہی کا اصلی جولانگاہ پہلا حصہ ہے۔ یہ درحقیقت نصف کتاب ہے اس میں سورۂ فاتحہ کے ایک ایک لفظ کی ایسی دلنشیں تشریح اور بصیرت افزا تفسیر ہے کہ اس سے اس سورہ کے امّ الکتاب (اصلِ قرآن) ہونے کا مسئلہ مشاہدۃً معلوم ہونے لگتا ہے۔ اور اسلام کے تمام مہمات مسائل اور اصُولِ دین پر ایک تبصرہ ہوجاتا ہے، خصوصاً قرآن پاک کے طرزِ استدلال، خالق کائنات کی ربوبیت و رحمت کے آثار و دلائل اتنی تفصیل سے لکھے ہیں کہ مصنّف کی وسعتِ علم و نظر کی داد بے اختیار دینی پڑتی ہے، اور امام غزالی نے "الحکمۃ فی مخلوقات اللّٰہ تعالیٰ" میں اور ابنِ قیّم نے "مفتاح دار السّعادۃ" میں اس مبحث پر جو کچھ لکھا تھا، اس سے زیادہ بسط و تشریح اور مقتضیاتِ زمانہ کی مطابقت سے "ترجمان القرآن" میں یہ بحث آگئی ہے۔ چنانچہ توحید اور دلائلِ توحید، نیز تخلیق بالحق، الہدیٰ اور الدّین کی مصنّف نے جو قرآنی تشریحیں کی ہیں، وہ اگر ایک طرف نکتہ پرور ہیں، تو دوسری طرف ایمان پرور ہیں۔

سرسیّد کے وقت سے لے کر آج تک جس لفظ نے ہوا پرستوں کو سب سے زیادہ گمراہ کیا ہے۔ وہ فطرۃ اللّٰہ کا لفظ ہے۔ ضرورت تھی کہ مولانا اس کی حقیقت کو بھی واضح فرماتے اور یہ بھی دل چاہتا تھا کہ مصنّف نے آثارِ ربوبیت، اور آثارِ رحمت پر جیسے سیر حاصل اور پُر معنی مباحث لکھے۔ ایسے ہی یوم الدّین اور مالکِ یوم الدین پر بھی ایک موثر بحث ہوتی، تاکہ ترازو کے دونوں پلّے برابر رہتے۔

سورہ بقرہ سے لے کر انعام تک کی تفسیر نہیں، بلکہ تفسیری ترجمہ ہے۔ اور اسی کا نام "ترجمان القرآن" ہے، اس میں مترجم نے یہ کیا ہے کہ اوّل ہر مضمون کو اختصار کے ساتھ

حاشیہ میں ایک کنارہ لکھ دیا ہے۔ پھر اُوپر آیت لکھ کر نیچے صفحہ میں تفسیری ترجمہ لکھا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ترجمہ کے لیے شاہ عبدالقادر صاحبؒ کا ترجمہ قرآن پیشِ نظر رہا ہے۔ یہ تو مشکل ہے کہ ہر شخص دوسرے سے ہر مقام پر اتفاق رائے کر سکے۔ تاہم بحیثیت مجموعی ترجمہ صحیح، دلنشیں، مؤثر اور باوقار ہے۔

ترجمان القرآن وقت کی اہم چیز ہے۔ ضرورت ہے کہ اس کو گھر گھر پھیلایا جائے اور نوجوانوں کو اس کے مطالعہ کی ترغیب دی جائے۔ اور ہر اسلامی دار المطالعہ میں اُس کا ایک نسخہ منگوا کر رکھا جائے۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادی

مولانا آزاد کا ترجمان القرآن

مولانا ابو الکلام آزاد نے اُردو ادب کے چمن میں حسنِ انشا و بیان کے جو پھول کھلائے ہیں یوں تو وہ سب ہی سدا بہار ہیں لیکن ۔

"مستقل تصنیف کی حیثیت سے قرآن مجید کی تفسیر ترجمان القرآن مولانا کی تمام علمی اور ادبی تحریروں میں شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے۔ قلم کی توانائی، اجتہادِ فکر، وسعتِ نظر و مطالعہ اور جذبۂ تحقیق و تدقیق، مولانا کی یہ وہ خصوصیات ہیں جو ان کی ہر علمی اور ادبی تحریر میں نظر آتی ہیں۔ لیکن مولانا کی یہ خصوصیات اس کتاب میں جا بجا نمایاں ہیں اور اسی بنا پر اُردو زبان کے علمی ذخیرے میں اس کو امتیازی مقام حاصل ہے۔"

عربی فارسی اور اردو میں سیکڑوں تفسیریں لکھی جا چکی ہیں لیکن ان کا عام رنگ یہ ہے کہ ایک آیت کی تشریح و توضیح میں یا اس سے مستخرج احکام کے بارے میں متقدمین مفسرین کے جو مختلف اقوال منقول ہیں ان سب کو نقل کرتے چلے جاتے ہیں اور ساتھ ہی اُن اقوال میں سے ہر ایک کی دلیل بھی بیان کر دیتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اربابِ علم ان سے استفادہ کر لیں تو کر لیں۔ لیکن عام لوگوں کا دماغ ان میں اُلجھ کر رہ جاتا ہے۔ اور قرآن کا جو مقصد ہے یعنی کسی حقیقت کو ذہن نشین کر کے اس کا یقین پیدا کر دینا، وہ حاصل نہیں ہوتا۔ علاوہ ازیں ہر مفسر کوشش کرتا ہے کہ وہ فقہ یا علم الکلام کے جس مسلک سے تعلق رکھتا ہے اس کو قرآن کی آیات سے ثابت کرے اور دوسرے مسلک کے لوگوں کی تردید میں ان سے استدلال کرے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قرآن کی تفسیر میں تاویل و توجیہہ کا ایک ایسا باب کھل جاتا ہے کہ قرآن کی عمومیت، اس کی جامعیت اور اس کی بے قید و بند تعلیمات محدود ہو کر رہ جاتی ہیں اور قرآن فقہی اور کلامی بحثوں کا میدان بن جاتا ہے۔

"مولانا نے اس عام روش کے خلاف بالکل ایک نیا طریقہ اور نیا اسلوب اختیار کیا

حوالہ: ماہنامہ آجکل دہلی، مولانا ابو الکلام آزاد نمبر ۱۹۵۸ء

ہے جو قرآن کی عمومیت کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ مولانا عربی زبان اور اس کے اسالیبِ بیان، صحابۂ کرام کے اقوال اور قدما مفسرین کی تشریحات و توضیحات کی روشنی میں کامل غور و خوض کے بعد قرآن کی آیت کا ایک مطلب معین کر لیتے ہیں اور اس کو کمال قوت و بلاغت کے ساتھ بیان کر دیتے ہیں۔"

اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ قاری کے ذہن میں اضطراب و تشویش کی کوئی کیفیت پیدا نہیں ہوتی اور قرآن کے حقائق و مطالب دل میں اُترتے چلے جاتے ہیں۔

عام تفسیروں کی ایک دوسری خصوصیت یہ ہے کہ ان میں بقول مولانا کے "وضعیت" پائی جاتی ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ زمانے کی رفتار کے ساتھ ساتھ جو جو علوم و فنون پیدا ہوتے رہے اور عام انسانی افکار و خیالات پر ان کی گرفت مضبوط ہوتی رہی۔ قرآن کی تفسیروں میں بھی اس کے اثرات نمایاں ہوتے رہے۔ چناں چہ امام فخر الدین رازی کی مشہور تفسیر کبیر کی نسبت کہنا پڑا کہ اس میں منطق، فلسفہ و حکمت، علم الکلام وغیرہ سب کچھ ہے مگر قرآن نہیں ہے۔ ہمارے زمانے میں اس کی سب سے بڑی مثال مصر کے علامہ جوہر طنطاوی کی ضخیم تفسیر جواہر القرآن ہے جس نے قرآن کو سائنس کے علوم و فنون کا ایک ذخیرہ بنا دیا ہے۔ ظاہر ہے یہ وضعیت یا صناعیت قرآن کی اس سادگی اور فطریت کے بالکل خلاف ہے جو اس کی ہر آیت میں نمایاں ہے۔ قرآن اگرچہ عقل کو نظر انداز نہیں کرتا لیکن اس کا عام طریقۂ استدلال وجدانی ہوتا ہے جس کو ہر شخص خواہ عالم ہو یا جاہل محسوس کرتا ہے اور اسی وجدانیت کے ذریعہ ہدایت اور اصلاح کا وہ مقصد حاصل ہو سکتا ہے جس کے لیے دنیا میں پیغمبر آتے رہے اور جس کے لیے خود قرآن کا نزول ہوا۔ اس سلسلے میں۔

"مولانا کا کمال یہ ہے کہ ایک طرف تو اُس فطریت اور سادگی کا سر رشتہ ہاتھ سے نہیں جانے دیتے جو قرآن کے اسلوبِ بیان کی نمایاں خصوصیت ہے اور دوسری جانب جہاں کہیں قرآن کی کسی تاریخی حقیقت کو بیان کرنے کے لیے سائنٹیفک طریقۂ استدلال کی ضرورت ہوتی ہے وہاں تحقیق و تدقیق اور بحث و نظر کا حق ادا کر دیتے ہیں۔"

چنانچہ قرآن میں ذوالقرنین نامی جس شخصیت کا ذکر آیا ہے اس کے بارے میں کافی اختلاف ہے کہ یہ کون شخص تھا؟ اکثر مفسرین کا رجحان یہ ہے کہ ذوالقرنین سے مراد سکندر مقدونی ہے۔ لیکن مولانا نے ان تمام آراء کے برخلاف بڑی تحقیق اور کاوش کے بعد آثار قدیمہ، انکشافات جدیدہ اور پھر خود قرآن کے بیان کی روشنی میں یہ ثابت کیا ہے کہ اس سے مراد ایران کا عظیم المرتبت بادشاہ کیخسرو ہے۔ مولانا نے اس بحث میں ایک بلند پایہ مؤرخ کا رول ادا کیا ہے اسی طرح۔

"خدا کی ذات و صفات پر سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں جو کلام کیا ہے وہ جس طرح انسانی فطرت و وجدان کو اپیل کرتا ہے فلسفہ کے طلباء اور علما کو بھی متاثر کرتا ہے۔ مولانا قرآن کی اصل فطریت اور سادگی اور اس کی وجدانیت کے ساتھ فلسفے و سائنس کا پیوند اس خوش اسلوبی کے ساتھ لگاتے ہیں کہ وضعیت کا رنگ غالب نہیں ہونے پاتا اور وجدان کی بیداری کے ساتھ عقل کی تسکین کا بھی سامان ہوتا رہتا ہے۔"

ان چیزوں سے قطع نظر عام تفسیروں میں ایک نقص یہ ہے کہ ان میں معمولی معمولی اور فروعی باتوں پر بہت زور دیا جاتا ہے۔ لیکن جہاں تک قرآن کی اہم اور بنیادی تعلیمات کا تعلق ہے جن کا رابطہ عام انسانی اجتماع و تمدن سے ہے ان پر یا تو کلام ہی نہیں کیا جاتا یا کلام کیا بھی تو محض سرسری اور ضمنی۔ جس سے قرآن کا بڑا مقصد فوت ہو جاتا ہے اور اس کا خطاب ایک قوم یا ایک جماعت کے ساتھ مختص ہو کر رہ جاتا ہے۔ مثلاً وحدت ادیان۔ اور دوسرے مذاہب اور ان کی الہامی کتابوں کی تصدیق۔ قرآن کی ایسی اہم اور بنیادی تعلیم ہے جس کو اس نے بار بار مختلف طریقوں سے بڑے شدومد کے ساتھ بیان کیا ہے۔ لیکن عام مفسرین نے اس پر زیادہ اعتنا نہیں کیا اور جہاں کہیں ایسی آیات آتی ہیں ان پر سرسری طور سے گذر گئے ہیں۔ متاخرین میں غالباً حضرت شاہ ولی اللہ الدہلوی پہلے شخص ہیں جنہوں نے حجۃ اللہ البالغہ میں اور دوسری کتابوں میں اس حقیقت کو زیادہ اُبھارا اور اُجاگر کیا ہے اور ان کے بعد مولانا ابو الکلام آزاد دوسرے بزرگ ہیں جنہوں نے اس بحث پر نہایت مدلل، واضح اور پُر زور کلام کیا ہے

اور اس سلسلے میں دین کی اصل حقیقت، عہد بعہد اس کا ارتقاء، شریعت و منہاج کا فرق، دین اور شریعت کا باہمی تعلق، دوسرے مذاہب، ان کے بانیوں اور ان کی آسمانی کتابوں کے متعلق قرآن کا نقطۂ نظر اور اس سلسلے میں پیغمبر اسلام کی عام دعوت اور انسانیت عامہ کی فلاح و بہبود کا اصل راز۔ ان تمام مباحث پر مولانا نے زورِ قلم، کمالِ بلاغت اور وسعتِ فکر و نظر کا حق ادا کر دیا ہے۔ اس بحث کو پڑھ کر صاف محسوس ہوتا ہے کہ قرآن اس پروردگارِ عالم کا کلام ہے جس کی ربوبیت اور پروردگاری ہر انسان اور ہر شخص کے لیے ہے اور وہ کسی خاص ایک گروہ کے ساتھ مخصوص نہیں۔ قرآن فرقہ بندیوں اور گروہ سازیوں کو توڑنا چاہتا ہے نہ کہ ان میں اور اضافہ کرنا۔ وہ ایمان اور اعمالِ صالحہ کی طرف جو دعوت دیتا ہے وہ ایک ایسی ازلی اور ابدی حقیقت ہے جو ہر مذہب کی بنیاد ہے اس لیے اس کا کام وصل کردن ہے نہ کہ فصل کردن۔

چنانچہ مولانا اسلام کے لفظ کی تشریح بھی اسی وحدتِ ادیان کی روشنی میں اس طرح کرتے ہیں:

"اس نے (قرآن نے) دین کے لئے الاسلام کا لفظ اسی لیے اختیار کیا ہے کہ "اسلام" کے معنی کسی بات کے مان لینے اور فرماں برداری کرنے کے ہیں وہ کہتا ہے دین کی حقیقت یہی ہے کہ خدا نے جو قانونِ سعادت انسان کے لیے ٹھہرا دیا ہے اس کی ٹھیک ٹھیک اطاعت کی جائے۔ وہ کہتا ہے۔ یہ کچھ انسان ہی کے لیے نہیں ہے بلکہ تمام کائناتِ ہستی اسی اصل پر قائم ہے۔ سب کے بقا و قیام کے لیے خدا نے کوئی قانونِ عمل ٹھہرا دیا ہے اور سب اس کی اطاعت کر رہے ہیں۔ اگر ایک لمحہ کے لیے بھی روگردانی کریں تو کارخانہ ہستی درہم برہم ہو جائے ...... وہ جب کہتا ہے "الاسلام" کے سوا کوئی دین اللہ کے نزدیک مقبول نہیں تو اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ دینِ حقیقی کے سوا جو ایک ہی ہے اور تمام رسولوں کی مشترک تعلیم ہے انسانی ساخت کی کوئی گروہ بندی مقبول نہیں۔"

مولانا نے اس بحث کے آخر میں ایک بڑا نکتہ پیدا کیا ہے۔ مجھ کو یاد نہیں پڑتا کہ کہیں کسی اور جگہ میری نظر سے گذرا ہو۔ یہ سب کچھ لکھنے کے بعد خود سوال کرتے ہیں کہ:۔

"جب قرآن کی دعوت کا یہ حال تھا تو پھر آخر اس میں اور اس کے مخالفوں میں وجہ نزاع کیا تھا؟ ایک شخص جو کسی کو برا نہیں کہتا سب کو مانتا اور سب کی تعظیم کرتا ہے اور ہمیشہ ان ہی باتوں کی تلقین کرتا ہے جو سب کے یہاں مانی ہوئی ہیں۔ کوئی اس سے لڑے تو کیوں لڑے؟ اور کیوں لوگوں کو اس کا ساتھ دینے سے انکار ہو؟"

اس سوال کو قائم کرنے کے بعد خود ہی اس کا جواب اس طرح دیتے ہیں:۔

"اصل یہ ہے کہ پیروانِ مذاہب کی مخالفت اس لیے نہ تھی کہ وہ (قرآن) انھیں جھٹلاتا کیوں ہے۔ بلکہ اس لیے تھی کہ جھٹلاتا کیوں نہیں؟ ہر مذہب کا پیرو چاہتا تھا کہ قرآن صرف اسی کو سچا کہے باقی سب کو جھٹلائے۔ اور چونکہ وہ یکساں طور پر سب کی تصدیق کرتا تھا اس لیے کوئی بھی اس سے خوش نہیں ہو سکتا تھا"

یہ جو کچھ عرض کیا گیا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ مولانا نے تفسیر میں جو کچھ لکھا ہے اس کا ذہنی پس منظر کیا ہے؟ اب سوال یہ ہے کہ یہ ذہنی پس منظر خود بخود بن گیا یا اس کی تعمیر میں چند خارجی مؤثرات و عوامل کا دخل ہے؟ اصل یہ ہے کہ انیسویں صدی کا نصف آخر اور بیسویں صدی کا شروع ایک ایسا دور ہے جس میں عالم اسلام نے فکری اور ذہنی طور پر ایک نئی کروٹ لی ہے۔ اس کے اسباب سیاسی بھی ہیں اور علمی بھی۔ دُنیا کے عام تمدنی حالات بھی ہیں اور علومِ جدیدہ کا ارتقاء بھی! اسی نئی کروٹ کا نتیجہ تھا کہ مصر میں مفتی عبدہٗ اور سید رشید رضا پیدا ہوئے اور ہندوستان میں شبلی اور سر سید۔ مولانا ابوالکلام کی سوانح عمری سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ایک طرف تو مولانا میں خود اجتہادِ فکر کی کمی نہیں تھی اور دوسری جانب وہ سید رشید رضا اور سر سید احمدؒ خاں دونوں کی تحریروں سے کافی متاثر تھے اور ان کا بکثرت مطالعہ کرتے تھے۔ چنانچہ اگر کوئی شخص سید رشید رضا کی تفسیر المنار اور

مولانا کا ترجمان القرآن ایک ساتھ مطالعہ کرے تو اسے صاف نظر آئے گا کہ ایک ہی سانچے میں ڈھلے ہوئے دو ذہن ہیں جو دو مختلف زبانوں میں اظہار مطلب کر رہے ہیں۔

متوسطین میں مولانا حافظ ابن تیمیہ اور حافظ ابن قیم سے کافی متاثر ہیں۔ الہلال اور البلاغ، کے زمانے میں مولانا کے قلم سے جو مذہبی تحریریں نکلیں ان میں یہ رنگ کافی نمایاں نظر آتا ہے۔ لیکن مولانا کے زورِ بیان وانشا اور قدرت و بلاغتِ کلام کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے خواہ کوئی فکر یا خیال کہیں سے لیا ہو لیکن اس کو اس بسط و تفصیل سے اور مدلل و مبرہن بیان کریں گے کہ اس فکر کے بانی اور موجد وہی نظر آئیں گے۔

شروع شروع میں جب مولانا کی کتاب "ترجمان القرآن" چھپ کر آئی تو جیسا کہ پہلے سے توقع تھی جہاں عام طور پر اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور سراہا گیا مسلمانوں کے ایک طبقے میں اس پر سخت تنقید اور نکتہ چینی بھی ہوئی۔ جو لوگ چار پانچ صدیوں سے اجتہادِ فکر سے محروم ہو کر تقلید محض اور جمود ذہنی کی زندگی بسر کر رہے ہوں ان میں مولانا ابو الکلام آزاد ایسے مجتہدِ فکر کا پیدا ہو جانا ان کے ہیجان کا باعث ہی ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ترجمان القرآن پر تنقیدیں ہوئیں اور بہت دنوں تک اخبارات اور رسائل میں یہ سلسلہ چلتا رہا۔ اگر ان تمام تنقیدوں کا تجزیہ کیا جائے تو ان تنقیدوں کا ماحصل صرف یہ دو چیزیں ملیں گی۔

۱۔ مولانا نے قرآنی حقائق کا بیان اور آیات کی تفاسیر میں بالکل قرآنی اسلوب کی پیروی کی ہے یعنی جہاں قرآن میں کوئی حقیقت مطلق ہے مولانا نے بھی اس کو اسی طرح بیان کیا ہے اور جو حقیقت مقید بیان کی گئی ہے مولانا نے بھی اس کی رعایت رکھی ہے اس اسلوب سے ان لوگوں کی تشفی تو ہو جاتی ہے جو قرآن کو فقہ و کلام کی فرقہ بندیوں سے بلند و بالا ہو کر پڑھتے ہیں لیکن جن دماغوں پر فقہی مکاتب خیال کا اس قدر غلبہ ہے کہ وہ ان سے الگ ہو کر کسی بات کو سوچ ہی نہیں سکتے ان کو یقیناً مولانا کے اسلوب و زاویۂ نظر سے اختلاف ہونا چاہیے۔

۲۔ دوسرا اعتراض یہ تھا کہ مولانا نے تفسیر بالرائے سے کام لیا ہے جس کی حدیث

میں مذمت آئی ہے لیکن یہ اعتراض بھی صحیح نہیں ہے کیونکہ جہاں تک مولانا کی تفسیر کے مآخذ کا سوال ہے ان کی نسبت مولانا نے خود لکھ دیا ہے کہ:

"پہلے اس کی تفسیر صحابہ و تابعین کی روایات میں ڈھونڈو۔ پھر بعد کے مفسروں کی طرف رُخ کرو اور دونوں کا مقابلہ کرو۔ صاف نظر آئے گا کہ صحابہ و سلف کی تفسیر میں معاملہ بالکل واضح تھا۔ بعد کی وقیقہ سنجیوں نے اسے کچھ سے کچھ بنا دیا اور الجھاؤ پیدا ہو گئے۔"

اس عبارت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نے جو کچھ لکھا ہے اس کی اصل صحابہ و سلف کے ہاں ضرور موجود ہے اور محض ایجاد بندہ نہیں ہے۔ جہاں تک تفسیر بالرائے کا تعلق ہے خود مولانا اس کے متعلق لکھتے ہیں:

"اشکال و مواقع کا بڑا دروازہ تفسیر بالرائے سے کھل گیا جس کے اندیشے سے صحابہ و سلف کی سوچیں لرزتی رہتی تھیں۔"

لیکن تفسیر بالرائے سے مولانا کی مراد کیا ہے؟ اس کو بھی مولانا کی زبان سے سن لیجیے تاکہ مولانا کا نقطۂ نظر سمجھنے میں کوئی گنجلک باقی نہ رہے۔ فرماتے ہیں:

"تفسیر بالرائے کا مطلب سمجھنے میں لوگوں کو لغزشیں ہوئی ہیں۔ تفسیر بالرائے کی ممانعت سے مقصود یہ نہ تھا کہ قرآن کے مطالب میں عقل و بصیرت سے کام نہ لیا جائے۔ کیونکہ اگر یہ مطلب ہو تو پھر قرآن کا درس و مطالعہ ہی بے سود ہو جائے۔ حالانکہ خود قرآن کا حال یہ ہے کہ اوّل سے آخر تک تعقل و تفکر کی دعوت ہے۔ اور ہر جگہ مطالبہ کرتا ہے کہ افلا یتدبرون القرآن ام علی قلوب اقفالھا

دراصل تفسیر بالرائے میں رائے لغوی معنی میں نہیں ہے بلکہ رائے مصطلحہ شارع ہے اور اس سے مقصود ایسی تفسیر ہے جو اس لیے نہ کی جائے کہ خود قرآن کیا کہتا ہے بلکہ اس لیے کی جائے کہ ہماری کوئی ٹھہرائی ہوئی رائے کیا چاہتی ہے اور کس طرح قرآن کو کھینچ تان کر اس کے مطابق کر دیا جا سکتا ہے۔"

اس بنا پر مولانا کو متداول اور مروجہ تفسیروں سے جو شکایت ہے وہ یہ ہے کہ:

"جس مقام کی تفسیر میں متعدد اقوال موجود ہوں گے وہاں اکثر اسی قول کو ترجیح دیں گے جو سب سے زیادہ کمزور اور بے محل ہوگا۔ جو اقوال نقل کریں گے ان میں بہتر قول موجود ہوگا لیکن اس کو نظر انداز کر دیں گے۔"

مولانا کی مندرجہ بالا عبارتوں سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ ان میں اور دوسرے مفسرین میں جو راہوں کا اختلاف ہے اس کا مبنی کیا ہے؟ اس بنا پر اگر بعض حلقوں میں مولانا کی تفسیر پر نکتہ چینی ہوئی تو وہ ہرگز خلافِ توقع اور محلِ تعجب نہیں ہے۔

ترجمان القرآن، قرآن مجید کی تفسیر بھی ہے اور ترجمہ بھی۔ اب تک آپ نے جو کچھ پڑھا وہ تفسیر سے متعلق تھا۔ اب چند باتیں ترجمہ کی نسبت سُن لیجیے۔ یہ ظاہر ہے کہ ایک زبان سے کسی دوسری زبان میں ترجمہ کرنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ جو لوگ اصل زبان سے واقف نہیں ہیں وہ ترجمہ کے ذریعہ اس عبارت کا مفہوم و مطلب سمجھ جائیں مگر عام طور پر قرآن کے جو تراجم اُردو میں پائے جاتے ہیں ان سے یہ مقصد حاصل نہیں ہوتا۔ کیونکہ یہ تراجم لفظی بلکہ تحت اللفظی ہیں اور اُن سے مقصد اخذ کرنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ اس قسم کے تراجم کے برخلاف مولوی نذیر احمد دہلوی نے ترجمۂ قرآن میں دلّی کی بولی ٹھولی کو اس درجہ دخل دیا کہ بعض مقامات پر قرآن کی سنجیدگی اور ثقاہت مجروح ہوگئی۔ لیکن مولانا نے نہ وہ راہ اختیار کی اور نہ یہ، بلکہ ایک طرف تو قرآن کی عظمت اور ثقاہت کا پورا خیال رکھتے ہیں اور ایسا کوئی لفظ نہیں آنے دیتے جو قرآن کے مرتبۂ ثقاہت سے فروتر ہو اور دوسری جانب ترجمہ کی ترتیب اس طرح قائم کی ہے کہ وہ اپنی وضاحت میں کسی کا محتاج نہیں۔ ایک عالم کی طرح ایک عام اردو خواں بھی اس سے پوری طرح استفادہ کر سکتا ہے۔ پھر مولانا نے صرف ترجمہ پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ جابجا نوٹوں کا بھی اضافہ ہے جن میں مطالبِ قرآن کی تفسیر و توضیح کی گئی ہے۔ قرآن میں جو مطلب یا جو حکم مجمل تھا اس کی تفصیل لکھی ہے تاکہ قرآن کا اصل مطلب سمجھنے میں کوئی دشواری نہ ہو اور جہاں جہاں قرآن کے کسی مطلب کو واضح کرنے کے لیئے دلائل و شواہد کی ضرورت تھی وہاں دلائل و شواہد ہیں۔ اس طرح یہ ترجمہ بجائے خود مستقل افادیت کا حامل ہے۔ اگر کوئی

شخص تفسیر کا مطالعہ نہ بھی کرے تو نفسِ ترجمہ اور اس پر جو نوٹس ہیں ان کی مدد سے قرآن کے مطالب کو سمجھ سکتا ہے۔

پھر ترجمہ اور تفسیر اور یہی نہیں بلکہ مولانا کے عام مذہبی مضامین کی ایک نمایاں خصوصیت جس پر شاید عام لوگوں کی نظر نہیں ہے، یہ ہے کہ ان سب میں مولانا کا اسلوبِ بیان وہی ہے جو قرآن کا ہے یعنی حکیمانہ ہونے کے ساتھ ساتھ خطیبانہ بھی ہے اس میں وعد بھی ہے اور وعید بھی بتشیر بھی ہے اور انذار بھی۔ کہیں وہ نسیم جاں فزا ہے اور کہیں برق صاعقہ فگن۔ اس لیے قدرتی طور پر اس کا اثر ہوتا ہے اور قاری میں ہیجانی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ مولانا کا یہ طرزِ ادائیہ اسلوب بیان اُن کے ہر مذہبی مضمون میں نمایاں ہے لیکن جہاں تک ترجمان القرآن کا تعلق ہے تو یہ شراب دو آتشہ بلکہ سہ آتشہ ہو گئی ہے اور اس لیئے غالب کا یہ شعر اس پر پوری طرح صادق آتا ہے ؎

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا

مولانا محمد حنیف ندوی

مولانا آزاد کی علمی، اصلاحی اور قرآنی خدمات

مولانا ابوالکلام آزاد پہلی دفعہ "الہلال" کی شکل میں عوام کے سامنے جلوہ گر ہوئے اور بدرِ کامل بن کے چمکے۔ یہ وہ زمانہ تھا، جب علی گڑھ تحریک کی بنیادیں استوار ہو رہی تھیں، مسلم لیگ میں رجعت پسند عناصر اکٹھا ہو کر اپنی وفاداری کا یقین دلا رہے تھے۔ تہذیب و ثقافت کے اعتبار سے یہ دور بڑا نازک دور تھا۔ مسلمان ایک طرف انگریز کی طرف سے مشکوک تھے اور ان کی تہذیب کو نفرت و حقارت کی نظر سے دیکھ رہے تھے، دوسری طرف خود ان میں وہ سب بُرائیاں جڑ پکڑ چکی تھیں جو ہر پسمت خوردہ قوموں کا مابہ الامتیاز ہوتی ہیں۔ احیاء و ترقی کی تمام راہیں مسدود نظر آتی تھیں، علمی شمعیں بجھ چکی تھیں، فضل و عرفان کی مسندیں اُلٹ چکی تھیں اور سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ قوم مایوس تھی۔ سرسید اٹھے اور انہوں نے اپنے رفقاء کی مدد سے ایک نئی تعلیمی تحریک کا آغاز کیا جو بظاہر صرف تعلیم کے لیے چیخ و پکار پر مشتمل تھی، مگر بباطن یہ ایک ایسی تحریک تھی جس کے کئی ضمنی پہلو بھی تھے۔ سرسید مرحوم کو بڑے قابل اور باہمت رفقاء ملے جن کی وساطت سے وہ اپنے مشن میں بڑی حد تک کامیاب ہوئے۔ انہوں نے تعلیم کی آواز میں کئی اور سُر بھی ملا دیے، کبھی یہ کہا کہ تہذیب و ثقافت کے اعتبار سے ہمیں تہذیب مغربی کو اپنا لینا چاہیے اور کبھی دین میں عذر خواہی اور معذرت طلبی کی رُوح سے متأثر ہو کر تاویلیں کیں۔ سرسید مرحوم نئی تہذیب اور نئے علوم کے اس درجہ مرعوب تھے کہ انہوں نے یورپ کے ہر وہم کو یقین سمجھا اور ہمارے ہر یقین کو وہم۔ اگر وہاں سے یہ آواز اٹھی کہ قانونِ قدرت کے خلاف کوئی بات نہیں ہوتی تو انہوں نے تمام معجزات کی تاویل کر ڈالی، اگر وہاں سے تعدّد ازدواج کے خلاف صدائے احتجاج بلند ہوئی کہ یہ تہذیب کے منافی ہے تو یہاں بھی اس کی حمایت میں قرآن میں گنجائش پیدا کر لی گئی۔ اگر کسی جاہل پادری نے یہ کہہ دیا کہ غلامی و رقیت ناجائز ہے اور عہدِ وحشت کی یادگار ہے تو مولوی چراغ علی کا قلم جنبش میں آگیا اور اس طرح پورے دین کو تاویل اور لیپ پوت کی بھینٹ چڑھا دیا گیا۔ سیاسی اعتبار سے بھی یہ مرعوبیت قائم رہی۔

حوالہ: مقتبس از مقالہ "چند خیالات" مشمولہ ابوالکلام آزاد مرتبہ عبداللہ بٹ۔ لاہور، ۱۹۴۳ء

انگریزی کی مخالفت اتنا بڑا جرم تھا کہ علی گڑھ کی حدود میں اس کا تصوّر بھی ناممکن تھا۔

اس اثنا میں مولانا ابوالکلام آزاد نے اس مرعوبیت کے خلاف اپنے پُرزور قلم کو حرکت دی اور اس قابلیّت کے ساتھ اس ذہنیت کا مقابلہ کیا کہ ہر چہار طرف سے مرحبا و احسنت کی آوازیں آنے لگیں۔ مولانا آزاد نے شاہ ولی اللہ کے بعد، پہلی دفعہ کتاب وسنت کی آواز اس دل کشی اور معقولیت سے پیش کی اور ان تمام قلعوں کو، جن کو سرسیدؒ اور ان کے قابل رفقا نے بڑی محنت سے تیار کیا تھا، ایک ہی جنبش قلم سے گرا دیا۔ سرسیدؒ کی آواز صرف ان لوگوں تک پہنچی جو پہلے سے اس قسم کی آواز کو سننے کے لیے تیار تھے مگر مولانا ہر دل تک پہنچے۔ مسدّس حالی کے بعد "الہلال" وہ مرصّع منثورہ ہے جس نے اسلامی احساسات کو بیدار کیا، اور مسلمانوں کے لیے بہترین غذائے روح کا اہتمام کیا۔ مسدّس کے اشعار جس طرح عوام کو ازبر یاد تھے، اسی طرح مولانا کے وہ مرصّع و پُرزور فقرے اور بلیغ جملے، خواص کی محفلوں میں مزے لے لے کر پڑھے اور دہرائے گئے مولانا نے ایک طرف، علی گڑھ تحریک کی مخالفت کی، سرسیدؒ کی مذہبی معذرت خواہانہ پالیسی کی تردید کی اور دوسری طرف سیاسی اعتبار سے مسلمانوں میں خود اعتمادی اور خودداری کے جذبات پیدا کیے۔ آج جس قدر بولنے والی زبانیں، خوددارانہ انداز میں سوچنے والے دماغ اور اسلامیات پر لکھنے والے قلم ہیں، ان سب کی تعمیر وتربیت میں الہلال نے بڑا حصّہ لیا ہے۔ ان سب کو گویائی اور صحیح اندازِ فکر الہلال نے بخشا ہے۔ اس کی اشاعت اور اس کے یقین پرور مقالوں سے نفسیاتی طور پر اس قسم کی فضا پیدا ہوگئی کہ لوگوں نے پھر سے اسلامی علوم ومعارف اور اسلامی تاریخ و رجال کو عزت و توقیر کی نظروں سے دیکھنا شروع کر دیا، بلکہ یہ شوق پیدا ہوا کہ اسی انداز میں از سرِ نو تمام تنظیمات اسلامیہ کو مرتب کیا جائے۔ مولانا نے اس میں اگرچہ ہر نوع کے مضامین لکھے ادبی، ثقافتی، تاریخی اور سیاسی میدانوں میں اپنی جولانی طبع کے جوہر دکھائے، مگر قرآن کی آیات کی تفسیر اور ان کے موزوں استعمال میں آپ نے جو جدّت پیدا کی وہ آپ کی مایۂ ناز خصوصیت ہے۔ آپ نے مضامین میں آیاتِ قرآن کو اس طریق سے استعمال کیا کہ ان میں ایک نئی معنویت پیدا ہوگئی۔

آیات کی تفسیر میں آپ کا انداز ایسا یقین پرور، ایمان افروز اور عالمانہ تھا کہ سرسیدؒ کے رفقا کی ریسرچ اس کے مقابلہ میں بالکل روکھی پھیکی اور پوچ معلوم ہونے لگی۔ یہاں سے قرآن کی ایک نئی ایمان افروز تفسیر کا تصوّر پیدا ہوا۔ جو جدل ومبحث کی آلائشوں سے پاک ہو اور جس میں تمام نوعِ انسانی کو مؤثر ترین اسلوب سے خدا کی طرف بلایا جائے، جو بحث ومناظرہ کا مجموعہ نہ ہو۔ اس میں وہ فقہی قیل وقال نہ ہو جو قرآن کی تفسیر کے

بالکل شایانِ شان نہیں یہ خیال کیا گیا کہ یہ کام صرف مولانا کر سکیں گے۔ کیونکہ وہی تفسیر کا صحیح ذوق پیدا کرنے کا باعث ہوئے تھے۔ اس کے بعد مطالبے اور تقاضے شروع ہوئے۔ بار بار مولانا کو توجہ دلائی گئی کہ بہر خدا خدا تمام کاروبارِ سیاست کو چھوڑ کر اس کام کی طرف توجہ مبذول فرمایئے۔ مگر مولانا کے سیاسی رفقا نے، ان کی ہمہ گیر صلاحیتوں کو معلوم کر لیا تھا، اس لیے انہوں نے، ان کو کبھی موقع نہیں دیا کہ وہ سکون کے ساتھ وہ کام کر سکیں۔ جس کے لیے فطرت نے ان کو پیدا کیا تھا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ اپنی ذہانت کی وجہ سے کانگرس میں ہمیشہ اپنی انفرادیت کو قائم رکھنے میں کامیاب رہے، اور مخالفین نے بھی آپ کی سیاسی قابلیتوں کا اعتراف کیا۔ مگر مولانا کے علمی مذاق اور ادبی صلاحیتوں کے لیے سیاسی ہنگامے کچھ زیادہ سازگار نہیں بلکہ آپ کا اصلی میدان تصنیف و تالیف ہے۔ یہاں مولانا جن علمی نوادر، اور مخترعات فکر کا باعث ہو سکتے ہیں۔ وہاں ان کے لیے کوئی گنجائش ہی نہیں نکل سکتی۔ آخر کئی سال کے مسلسل انتظار اور وقفوں کے بعد مولانا نے ترجمان القرآن کی پہلی جلد اور پھر دوسری جلد شایع فرمائی۔

الہلال میں مولانا کے دینی مقالوں اور تفسیری مضامین کو پڑھ کر آیندہ تفسیر کے متعلق لوگوں نے جس قسم کی تفسیر کی توقعات قائم کر رکھی تھیں۔ وہ توقعات ان کی ترجمان کو دیکھ کر پوری نہیں ہوتیں، اور اس کا سبب یہ ہے کہ مولانا کی ذہنی تعلیم و تربیت نے اس اثنا میں کئی منزلیں اور طے کر لیں۔ اور ان کا پرانا زاویۂ نظر یک قلم بدل گیا۔ الہلال کے صفحات میں ان کی حیثیت ایک ظاہری کتاب و سنت کے ٹھیٹھ حامی کی ہے۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ ابن تیمیہ کی روح ان میں عود کر آئی ہے، وہی جوش ہے سنت کی حمایت و دعوت کا وہی انداز ہے، وہی وسعت نظر ہے، وہی فصاحت و بلاغت اور ادبیت ہے۔ وہی جامعیت ہے اور معقولیوں کے جواب میں وہی روش استدلال۔ مگر ترجمان میں وہ بالکل ایک نئی شان سے جلوہ آرا ہوئے ہیں۔ یہاں اس گہرے دینی ذوق کی بجائے نئے افکار اور تصورات کی جھلک ہے۔ عقلیت کا غلبہ ہے۔ اس میں مذہب کا تصور زیادہ وسیع اور حکیمانہ زاویۂ نظر سے پیش کیا گیا ہے۔ بہت سے خیالات ایسے ہیں جو بھنچے بھنچے معلوم ہوتے ہیں، اور مزید توضیح کے محتاج۔ مولانا نے عمداً ان کو زیادہ نمایاں کر کے پیش نہیں کیا۔ مولانا کے سامنے چونکہ تمام نئے علمی افکار و تصورات تھے، اور ان سب کو ملحوظ و مرعی رکھ کر یہ تفسیر لکھی ہے۔ اس

لیے اس میں اُن سب افکار کا رنگ کسی نہ کسی حیثیت سے موجود ہے۔ بغلی وضمنی تبویب بہت جامع ہے۔ اس میں اختصار کے ساتھ بہت سی مفید باتیں آگئی ہیں۔ تفصیل کے ساتھ بہت کم چیزیں لکھی ہیں۔ البتہ پہلی جلد میں خدا پرستی اور عمل صالح کی بحث اور دوسری جلد میں سورۂ کہف کی تفسیر بہت شاندار ہے۔ مذہب و خدا پرستی کی بحث میں مولانا نے جو انداز اختیار کیا ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس سے غلط فہمیوں کا ایک باب کھُل گیا، اگر اس کو زیادہ احتیاط اور وضاحت سے مولینا لکھتے، تو غالباً مخالفت کا وہ ہنگامہ پیدا نہ ہوتا۔ ہم دیانت داری سے یہ سمجھتے ہیں کہ مخالفین نے اس سلسلہ میں مولانا سے انصاف نہیں کیا۔ مولانا نے ایک مکتوب کے ذریعہ یہ بات واضح کر دی تھی کہ میرا منشا ہرگز یہ نہیں تھا جو بعض لوگ سمجھے ہیں۔ جو بات صحیح ہے وہ صرف یہ ہے کہ اندازِ بیان میں زیادہ عموم ہے، جس سے غلط فہمی آسانی سے پیدا ہو سکتی ہے اور پیدا ہوئی۔ لیکن مولانا کی تصریحات کے بعد بحث کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔

بہ حیثیت مجموعی ترجمان القرآن اپنے دور کی بہترین تفسیر ہے، بلکہ زیادہ صحیح تر تعبیر یہ ہے کہ اپنے دور کی بہترین تصنیف ہے۔ اس لیے کہ اس میں بہترین تفسیر کی بہ نسبت بہترین تصنیف ہونے کی زیادہ صلاحیتیں ہیں۔ اس کا ترجمہ بہت صاف اور مؤثر ہے۔

سید عبداللطیف

ایک غیر مکمل شاہ کار

علوم اسلامیہ کے میدان میں اپنی آزمائشوں اور کامیابیوں پر ایک نظر بازپسیں ڈالتے ہوئے اور خصوصاً اپنے شاہ کار ترجمان القرآن کا ذکر کرتے ہوئے مولانا ابوالکلام آزاد نے لکھا ہے:

"کامل ستائیس برس سے قرآن میرے شب و روز کے فکر و نظر کا موضوع رہا ہے۔ اس کی ایک ایک سورت، ایک ایک مقام، ایک ایک آیت، ایک ایک لفظ پر میں نے وادیاں قطع کی ہیں اور مرحلوں پہ مرحلے طے کیے ہیں۔ تفاسیر و کتب کا جتنا مطبوعہ و غیر مطبوعہ ذخیرہ موجود ہے، میں کہہ سکتا ہوں کہ اس کا بڑا حصہ میری نظر سے گزر چکا ہے اور علوم قرآن کے مباحث و مقالات کا کوئی گوشہ نہیں جس کی طرف سے حتی الوسع ذہن نے تغافل اور جستجو نے تساہل کیا ہو۔ علم و نظر کی راہوں میں آج کل قدیم و جدید کی تقسیمیں کی جاتی ہیں، لیکن میرے لیے یہ تقسیمیں بھی کوئی تقسیم نہیں، جو کچھ قدیم ہے وہ مجھے ورثہ میں ملا اور کچھ جدید ہے اس کے لیے اپنی راہیں آپ نکال لیں۔ میرے لیے وقت کی جدید راہیں بھی ویسی ہی دیکھی بھالی ہیں جس طرح قدیم راہوں میں گام فرسائی کرتا رہا ہوں۔

رہا ہوں رند بھی اے شیخ پارسا بھی میں\
مری نگاہ میں ہے رند و پارسا ایک ایک

خاندان، تعلیم اور سوسائٹی کے اثرات نے جو کچھ میرے حوالے کیا تھا میں نے اوّل روز ہی اس پر قناعت کرنے سے انکار کر دیا، اور تقلید کی بندشیں کسی گوشے میں بھی رو ِل نہ ہو سکیں اور تحقیق کی تشنگی نے کسی میدان میں بھی ساتھ نہ چھوڑا . . . میرے دل کا کوئی یقین ایسا نہیں ہے جس میں شک کے سارے کانٹے نہ چبھ چکے ہوں اور میری روح کا کوئی اعتقاد ایسا نہیں جو انکار کی ساری آزمائشوں میں سے نہ گزر چکا ہو۔ میں نے زہر کے گھونٹ بھی ہر جام سے پیے ہیں۔ اور تریاق کے نسخے بھی ہر دار الشفاء کے آزمائے ہیں۔ میں جب پیاسا تھا تو میری لب تشنگیاں دوسروں کی طرح نہ تھیں اور جب سیراب ہوا تو میری سیرابی کا سرچشمہ بھی شاہراہِ

حوالہ: ابوالکلام آزاد (انگریزی) مرتبہ ہمایوں کبیر

عام پر نہ تھا...... اس تمام عرصے کی جستجو و طلب کے بعد قرآن کو جیسا کچھ اور جتنا کچھ سمجھ سکا ہوں میں نے اس کتاب کے صفحوں پر پھیلا دیا ہے:

سبک نہ جائے نگیری کہ بس گراں گہرست
متاع من کہ نصیبش مباد ارزانی۔[۱]"

یہ ہے مختصراً مولانا آزاد کا خیال علوم اسلامیہ کے دائرہ میں اپنے ذہن کے نشوونما وترقی کے متعلق! یہ عبارت اس دیباچے کا اقتباس ہے جو انہوں نے اپنی کتاب ترجمان القرآن جلد اول کے لیے میرٹھ کے قید خانے میں سنہ ۱۹۳۰ء میں لکھا تھا اور اسی سال یہ کتاب شائع بھی ہو گئی۔[۲] میں اس کو مولانا کا آخری کارنامہ قرار دیتا ہوں، کیونکہ اس کے بعد انہیں ملک کی آزادی کے حصول کے لیے ایک طویل عرصے تک شدید سیاسی کش مکش میں مبتلا ہونا پڑا اور اس طرح انہیں حالات نے موقع نہیں دیا کہ وہ علوم اسلامیہ میں کوئی خاص اہمیت یا جدت وندرت کا کام کر سکیں۔ اس سے میرا یہ مطلب نہیں کہ ترجمان القرآن کے شائع ہو جانے کے بعد ان کا قلب اسلامی زندگی کے مسائل پر یا علوم اسلامیہ پر تفکر و تدبر نہیں کرتا رہا۔ یہ واقعہ ہے کہ انہوں نے اپنی شدید سیاسی مصروفیتوں میں سے کچھ وقت نکال کر ترجمان القرآن کی نظر ثانی کی اور اس کے مقدمہ میں احمد نگر کے محبس ہی میں بیٹھ کر اضافے کیے۔ ان کی زندگی کے آخری تین سالوں میں ان کی چند مشہور تصانیف کے انگریزی میں ترجمہ کرنے کے سلسلے میں مجھے ان سے گفتگو کرنے کے لیے نئی دہلی میں ان کے مکان پر متعدد بار ٹھیرنے کا اتفاق ہوا۔ میں نے اس زمانہ میں بھی محسوس کیا کہ ان کا ذہن ان مسائل پر غور کرنے پر ہمیشہ آمادہ رہتا ہے جو غور وفکر کے طالب ہوتے ہیں۔......

اسلام کا وہ کون سا پہلو تھا جس پر مولانا نے اپنی رائے کا اظہار نہ کیا ہو! شاید ہی کوئی ایسا پہلو نکل سکے تو نکل سکے! اسلامی موضوعات پر انہوں نے جو مضامین اپنے رسائل لسان الصدق، الہلال، اور البلاغ میں لکھے اور پھر ان کے خطبے اور رسالے۔ ان سب کی ایک بہت طویل فہرست ہوتی ہے! ان تحریروں کا باعث اسلامی دنیا اور اس وقت کے ہندوستان کے سیاسی و معاشری انقلاب رہے ہیں۔ یہ سب تحریریں اسلام کے بعض بنیادی پہلوؤں کی نہایت اہم توضیحات ثابت ہوئی ہیں جن کی تائید قرآن کریم یا سنت نبوی سے

---

[۱] ترجمان القرآن جلد اول ص ۱۸۔۱۹ [۲] ترجمان القرآن اس سال شایع نہیں ہو سکا۔ کتابت اور طباعت کے مرحلے سے گزرتے گزرتے ایک سال کا عرصہ لگ گیا ہے اور ۱۳۵۰ھ مطابق ۱۹۳۱ء میں شائع ہوا (شاہجہان پوری)

ہوتی ہے۔۔۔۔ یہ فکر اسلامی کے دائرہ کی چند دل کش تجلیات ہیں! ان سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ مولانا کا ذہن کتنی بلندیوں تک پرواز کر سکتا ہے۔ لیکن اگر کوئی ان کے ذہن سے کاملاً واقف ہونا چاہیے اور ان کے علم و فضل کی وسعتوں کا اندازہ کرنا مقصود ہو تو اس کو لازماً ترجمان القرآن کی طرف رجوع کرنا پڑے گا جو ان کا شاہ کار ہے، اس میں انہوں نے قرآن کے ہر مسئلے سے بحث کی ہے۔ اور اسلامی تعلیمات کے بعض اہم مباحث پر نہایت فکر انگیز خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اس کتاب کو انہیں اپنی عملی سیاسی زندگی کی الجھنوں میں وقت نکال کر تیار کرنا پڑا کیونکہ اسلامی علوم کے ہر مرکز سے اس کا شدید مطالبہ کیا جا رہا تھا۔ اس کتاب میں ان کی تخلیق و ابداعی قابلیت کے انوار کچھ اس طرح جمع ہو گئے اور ایک دوسرے میں اس طرح متداخل ہو گئے ہیں کہ پڑھنے والے کے ذہن کی ساری فضا جگمگا اٹھتی ہے!

مولانا آزاد نے اسلامی افکار کے دائرے میں جو خدمت کی ہے اُس کی مختلف شکلیں ہیں اور اس کا دائرہ بحث و نظر زندگی کے تمام اہم مسائل تک پھیلا ہوا ہے۔ خواہ ان مسائل کا تعلق عقاید سے ہو، خواہ فلسفہ سے، خواہ قانون سے جن پر مسلمانوں کی تاریخ کے دوران میں علمائے اسلام نے غور و خوض کیا ہے۔ دبہر حال، ان سے خواہش کی گئی کہ وہ ساتھ ساتھ قرآن حکیم کی ایک کامل تفسیر بھی لکھیں۔

اس خواہش کی تکمیل کے سلسلے میں مولانا آزاد کے پیش نظر تین کتابیں لکھنے کا منصوبہ تھا۔ یہ تینوں کتابیں ایک دوسرے سے خاص تعلق رکھتی تھیں گویا کہ ایک ہی سلسلے کی مختلف کڑیاں تھیں۔

ایک میں تو قرآن اپنا آپ مفسر ہو گا بغیر کسی دوسرے مفسر کی احتیاج کے۔ یہ متوسط قابلیت رکھنے والوں کے مطالعے کی ضرورت پوری کرے گی۔ اس کا نام ترجمان القرآن ہو گا۔

دوسری کتاب کا عنوان تفسیر البیان ہو گا، مولانا کے نزدیک یہ ان شائقین کے لیے تھی جنہیں قرآن حکیم کی تفصیلات سے دلچسپی ہے۔

تیسری کتاب "البصائر" کے نام سے بطور مقدمۂ تفسیر کے تھی، اس میں قرآن کریم کے مقاصد اور اصول سے بحث کی جانی تھی جو اہل علم و نظر کے کام آتی۔

لیکن یہ تینوں کتابیں الگ الگ شائع نہ کی جا سکیں۔ قومی و ملکی حالات نے مولانا کو جو زندگی گذارنے پر مجبور کر دیا تھا اس میں اتنی مہلت نہ مل سکی کہ مولانا اپنے پہلے منصوبے کے مطابق یہ تینوں کتابیں مرتب کر دیتے۔ لہٰذا ان مشکل حالات میں ان تینوں عنوانوں کے تحت جو کچھ لکھا گیا تھا وہ ترجمان القرآن کے نام

سے دو جلدوں میں ۱۹۳۱ء اور ۱۹۳۶ء میں شائع کر دیا حالانکہ یہ عنوان "ان تین کتابوں میں سے صرف ایک کا تھا لیکن اپنے موضوع اور مضمون کے لحاظ سے جامع تھا اور دوسری کتابوں کے تمام مباحث کو بھی اس میں سمیٹ لیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ اس میں اکثر وہ چیزیں آگئی ہیں جو مولانا نے اپنے بے شمار مقالوں، اور تحریروں اور دوسری کتابوں میں لکھی ہیں اور فکر دینی پر ان کی شاہ کار سمجھی جاتی ہے۔ ....

ترجمان القرآن کی اشاعت میری رائے میں مولانا آزاد کی زندگی کا ایک نہایت اہم واقعہ ہے۔ کیونکہ ترجمان القرآن کی تحریر و تصنیف کا زمانہ مولانا کی سیاسی زندگی کا نہایت تکلیف دہ زمانہ ہے جو تقریباً پندرہ سال کی مدت پر پھیلا ہوا ہے اور ان آزمائشوں کا زمانہ ہے جن سے ایک محب وطن عالم کو گذرنا پڑتا تھا جب وہ ایک ہی وقت میں دو کام کرنا چاہتا تھا۔ ان میں سے ایک کام کی تکمیل کے لیے خانقاہ کے سکون کی ضرورت تھی اور دوسرے کام کے لیے میدان جنگ کے شدائد اور شب بیداریاں منتظر تھیں۔ ......

ترجمان القرآن کی پہلی جلد کی اشاعت کے بعد (۱۹۳۶ء میں) دوسری جلد شائع ہوئی جس میں قرآن کریم کے اٹھارہ پاروں کا ترجمہ اور سورت کے اہم مقامات پر نہایت تحقیقی اور فکر انگیز بحث اور خاص خاص آیات کی تفسیر ہے۔ ان دونوں جلدوں پر نظر ثانی کا کام مولانا نے قلعہ احمد نگر میں اسارت کے زمانے میں کیا اس کے بعد ان کے دوسرے ایڈیشن شائع ہوئے۔ لیکن اس سلسلے کی تیسری اور آخری جلد مولانا کی زندگی میں شائع نہ ہو سکی۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ اس کا مواد تیار نہ تھا، مواد بالکل تیار تھا جیسا کہ مولانا کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے۔ وزیر تعلیم ہونے کی وجہ سے مولانا کے فرائض منصبی کی مشغولیتیں کچھ اس قدر زیادہ رہیں کہ وہ اپنے مسودات کو دوبارہ پڑھ کر پریس کے لیے تیار نہ کر سکے۔ مولانا کی وفات سے چند ماہ قبل ان کے سکریٹری پروفیسر محمد اجمل خاں نے مجھ سے خواہش کی کہ میں مولانا سے دریافت کروں کہ آیا اس کا مسودہ اشاعت کے لیے ڈھونڈھ نکالا جا سکتا ہے؟ ایک دن میں نے اجمل خان صاحب کی موجودگی ہی میں مولانا سے عرض کی کہ اگر انہیں اتنی فرصت نہیں کہ اس جلد کی کتابت وطباعت کی تفصیلات کی نگرانی خود فرمائیں تو یہ کام میرے سپرد کیا جا سکتا ہے۔ میں خان صاحب کے ساتھ مل کر اس کو پریس کے لیے تیار کر دوں گا اور آپ کو صرف اسی وقت ہدایت یا مشورے کے لیے زحمت دوں گا جب اس کے سوا کوئی چارۂ کار ہی نہ ہو۔ مولانا نے میری تجویز سے اتفاق فرمایا، لیکن دو دن کے بعد مجھ سے فرمایا کہ

"میں نے مسودہ تلاش کیا لیکن معلوم ہوتا ہے وہ یہاں نہیں (یعنی ۴/کنگ ایڈورڈ روڈ، نئی دہلی)۔ میرا خیال ہے کہ وہ ان صندوقوں میں سے کسی ایک صندوق میں پڑا ہوگا جو قلعہ احمد نگر جیل سے لائے گئے تھے۔ یہ صندوق کلکتہ میں ہیں"۔ ۲۲ فروری ۱۹۵۸ء کو مولانا کی وفات کے المناک حادثے سے قضا و قدر کا یہ منشا ظاہر ہوا کہ خود مولانا اس مسودے کی تلاش نہ کریں، اب یہ کام دوسرے افراد اور اداروں کا ہے۔ خصوصاً ساہتیہ اکادیمی کا، جس نے مولانا کی تمام تحریروں کو مرتب کرکے شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے، وہ اس مسودہ کو ڈھونڈھ نکالے۔ جہاں تک نشان دہی کا تعلق ہے تو وہ خود مولانا نے کردی ہے۔ اگر یہ مل جائے اور اس کو شائع کردیا جائے تو قرآن کی جو خدمت مولانا نے کی ہے اس سلسلے کی تکمیل ہو جائے گی۔

افسوس اس بات کا ہے کہ مولانا نے قرآن پر جتنا کام کیا ہے وہ اس تعلیم یافتہ طبقہ کی دسترس سے باہر ہے جو اُردو زبان سے واقف نہیں۔ اگر ابتداہی سے اس امر کی کوشش کی جاتی کہ قرآن کی تفسیر کا جتنا کام مولانا نے کیا ہے اس کا انگریزی زبان میں جس کو دنیا کے اکثر ممالک کا روشن خیال طبقہ سمجھتا ہے، ترجمہ کردیا جاتے۔ نیز عربی، فارسی اور ترکی زبانوں میں جو مغربی ایشیا کے مسلمانوں کی زبانیں ہیں، اس کے ترجمے کردیئے جاتے اور اسی طرح ہندوستان کی ممتاز زبانوں ہندی، بنگالی وغیرہ میں بھی یہ کام ہو جاتا تو بے شبہ اسلام کی نشأۃ ثانیہ کا آغاز ہو جاتا اور اس کے نتیجے کے طور پر دنیا بھر کے مسلمان دوسرے مذاہب کے پیروؤں سے زیادہ قریب ہو جاتے[1]۔

تاہم اس سمت میں اب بھی ابتدا کی جا سکتی ہے۔ اپنی تمام کتابوں میں مولانا آزاد سورۂ فاتحہ کی تفسیر کو سب سے زیادہ اہم سمجھتے تھے جس میں انہوں نے قرآن حکیم کے اساسی تصورات کی وضاحت کی ہے جو اس سورۃ کی سات مختصر آیتوں میں اجمالاً موجود ہیں۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے تین سال قبل انہیں یہ خیال آیا کہ اس کا انگریزی میں ترجمہ ہو جانا ضروری ہے۔ انہوں نے ڈاکٹر سید محمود سے کہا کہ وہ مجھ سے دریافت کریں کہ کیا میں اس کام کے لیے آمادہ ہوں۔ اس معاملہ میں مولانا کی خواہش میرے لیے گویا حکم تھی۔ خدا کے

---

[1] اور اس طرح یہ بھی ممکن ہو جاتا کہ اسلامی تعلیمات کے بارے میں وہ غلط فہمیاں دُور ہو جائیں جو ہم سایہ اقوام میں باوجودیکہ مسلمان ایک ہزار سال سے یہاں آباد ہیں، پائی جاتی ہیں۔ اس کی وجہ اس کے سوا کوئی دوسری نہیں کہ ہمارے علمائے گردوپیش کے حالات کے مطابق تبلیغ و اشاعت اسلام کی حکمت عملی اور اپنی ذمہ داری کے بارے میں کبھی سنجیدگی کے ساتھ غور نہیں فرمایا۔ (شاہجہان پوری)

فضل سے کام انجام کو پہنچا، اور مولانا نے دینیاتی اصطلاحات کے ترجمہ کے سلسلہ میں جو مشورے دیے ان کو پوری طرح ملحوظ رکھا گیا۔ لیکن اس کی اشاعت سے پہلے مولانا نے خیال کیا کہ اس کی ایک تلخیص شائع کر دی جائے جس کا عنوان "قرآن کے اساسی تصورات" رکھا جائے۔ اس تلخیص کو مولانا نے خود ملاحظہ فرمایا اور پریس کو روانہ کرنے کی ہدایت فرمائی، چنانچہ فروری ۱۹۵۸ء کے پہلے ہفتہ میں اس کو مدراس کے ڈیوسی سن پریس بھیج دیا گیا۔ یہ مئی کے اختتام تک شائع ہو جائے گی[1] اس کے بعد سورۂ فاتحہ کی تفسیر کا ترجمہ طباعت کے لیے دے دیا جائے گا۔ خیال یہ تھا کہ اس کے بعد سارے ترجمان القرآن کا انگریزی میں بالاقساط ترجمہ شائع کیا جائے۔ اب یہ کام ہو بھی سکے گا یا نہیں میں کچھ بتلا نہیں سکتا۔ "قرآن کے اساسی تصورات" اور سورۂ فاتحہ کی تفسیر کا ترجمہ دونوں اپنے ٹھیک وقت پر شائع ہو جائیں گے۔ لیکن غم اس بات کا ہے کہ یہ اس وقت شائع ہوں گے جب مولانا ہم میں نہ ہوں گے![2]

ان کے آخری وقت کا نظارہ اب بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے! شاید اس کا دیکھنا میرے لیے مقدر تھا۔ میں جب حیدر آباد سے نئی دہلی کو روانہ ہوا تو میرے پیش نظر انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز کے سالانہ اجلاس کی شرکت تھی جو ۱۴ اور ۱۵ فروری ۱۹۵۸ء کو ہونے والا تھا۔ میرے حاشیۂ خیال میں بھی نہ تھا کہ میں دہلی مولانا کی تجہیز و تکفین کے لیے جا رہا ہوں۔ ہمیشہ کی طرح اس دفعہ بھی میں ان ہی کے مکان میں ٹھیرا اور ۱۶ فروری کو دہلی سے رخصت ہونے والا تھا۔ میں نے ریل میں اپنی جگہ بھی محفوظ کرالی تھی اور کوئی وجہ نہیں تھی کہ وہاں کچھ عرصہ اور ٹھیرتا۔ لیکن سولھویں کی صبح کو مولانا نے مجھ سے کہا کہ میں اپنی روانگی ملتوی کر دوں اور کچھ دن اور ٹھیر جاؤں۔ میں ٹھیر گیا، لیکن محض اس لیے کہ اس غم میں شریک رہوں جو سبھوں پر نازل ہونے والا تھا۔ انہوں نے مجھے ٹھیر جانے کے لیے کیوں کہا؟ کیا آنے والے واقعہ کی انہیں خبر ہو گئی تھی؟

میرے قلب میں ابھی ان کا غم تازہ ہے، اور میرے لیے موزوں الفاظ میں یہ بتلانا ممکن نہیں کہ میری نگاہ میں ان کی بحیثیت عالم اور بحیثیت انسان کتنی قدر تھی۔ یہ جو کچھ بھی میں نے لکھا ہے بڑی مشکل

---

[1] سورہ فاتحہ کی تعلیمات کا خلاصہ انگریزی میں "بیسک کنسپٹس آف دی قرآن" کے نام سے اکیڈمی آف اسلامک اسٹڈیز حیدر آباد (دکن) کی جانب سے شائع ہو گیا ہے۔

[2] ترجمان القرآن کی دونوں جلدوں کا انگریزی ترجمہ تین جلدوں میں ایشیا پبلشنگ ہاؤس بمبئی کی جانب سے شائع ہو گیا ہے (دھیمان پوری)

سے لکھا ہے ۔ مجھے ان کی کتابوں سے ان کے قلب اور روح کے مشاہدہ کا موقع ملا ہے ۔ یہ بھی میری خوش نصیبی ہے کہ ان کی عمر کی آخری منزل میں کبھی کبھی کچھ وقت سکون کے ساتھ ان کی صحبت میں بسر کر سکا اور ان کی شرافتِ نفس سے محظوظ ہوا۔ دعا ہے کہ ان کی روح کو سکینت تامہ نصیب ہو۔ وہ ان برگزیدہ ہستیوں میں سے تھے جو اپنی زندگی کی ابتلاء سے گزر کر جب واپس ہوتی ہیں تو پکارنے والا پکارتا ہے:

يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً. فَادْخُلِي فِي عِبَادِي. وَادْخُلِي جَنَّتِي. (۸۹ ، ۲۷ تا ۳۰)

اے اطمینان والی روح ! تو اپنے پروردگار کی طرف چل اس طرح کہ تو اس سے خوش اور وہ تجھ سے خوش، پھر تو میرے بندوں میں شامل ہو جا اور میری جنت میں داخل ہو جا۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی قرآنی خدمات

تصنیفات و تالیفات

امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد نور اللہ مرقدہ کو اللہ تعالیٰ نے علم و فضل اور فکر و سیرت کے اعلیٰ محاسن اور نظر و بصیرت کی بہترین دولتوں سے نوازا تھا۔ وہ ادیب و شاعر تھے، صحافی و خطیب تھے، مدبّر و مفکّر تھے، عالم و مؤرخ تھے، وہ فلسفی اور ماہرِ تعلیم تھے اور فکر و نظر کے ہر دائرے میں اپنا بلند مقام رکھتے تھے۔ پھر وہ مختلف علوم و فنون کے صرف اصول و مبادی ہی سے واقف نہ تھے بلکہ بعض علوم کے متعدد فروع میں بھی ان کی نظر و بصیرت کا پیمانہ ان علوم کے متخصصین سے زیادہ بلند تھا، علمِ دین ہی کو لیجیے تو تفسیر، حدیث، فقہ، اصول وغیرہ فروع میں ان کے مقالات و مکالمات ان کی مجتہدانہ و محققانہ بصیرت اور شانِ علم و تبحر کا بہترین ثبوت اور کمالِ تفقّہ کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے ان کی ایک ذات میں ایسی بہت سی خوبیاں جمع ہو گئی تھیں جو ایک عہد میں ایک قوم کے بہت سے افراد میں شاذ کے درجے میں ہوتی ہیں۔ اسی لیے وقت کے ایک صاحبِ نظر نے ان کی شخصیت کو جامع جہات اور جامع صفات قرار دیا ہے۔

مولانا کے والد مولوی خیر الدین مرحوم نے ان کا تاریخی نام "فیروز بخت" (۱۳۰۵ھ) رکھا تھا۔ ان کے نام کی فیروز بختی کو ہم ان کی زندگی کے ہر دور میں ان کی ذات پر سایہ افگن دیکھتے ہیں۔ ان کی سب سے بڑی فیروز بختی یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں فکرِ سلیم کی دولت اور دین کے اعلیٰ ذوق سے نوازا تھا، نیز اوائل عمر ہی میں انہیں بعض ایسی صحبتیں میسّر آگئیں جن کے فیضان سے کتاب و سنت کا وہ باب مقصود ان پر کھل گیا جو شاید ان کے گھر کی رسمی و روایتی زندگی اور ان کے والد کے عقیدہ و فکر کی رہنمائی سے کبھی وا نہ ہو سکتا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے مولانا آزادؒ کو علم و فکر کے جن بہت سے فضائل سے نوازا تھا، ان کی ذات میں نظر و بصیرت کی جن بہت سی خوبیوں کو جمع فرما دیا تھا اور جن اعمالِ حسنہ اور خدمات دین و ملت

کی توفیق ارزانی فرمائی تھی، اگر غور سے دیکھا جائے تو ان میں ایک ایسا کمال بھی نظر آجائے گا، جسے جامع الکمالات کہنا چاہیے یا ان کی بنیادی شخصیت اور شخصیت کے تمام محاسن کا محور، زندگی کا اصل الاصول اور تمام خدماتِ اسلامی اور اعمالِ قومی کی جوئے بہار آفرین کا سرچشمۂ فیض سمجھنا چاہیے، یہی مولانا کی شخصیت کی تعمیر کا بنیادی پتھر ہے اور یہی اس خانقاہِ عظمتِ اسلاف کا سب سے اونچا کنگرہ ہے۔ مولانا کی شخصیت کا یہ کمال، فضائل کا یہ محور، تعمیر کا بنیادی پتھر، عظمت کا سب سے اونچا کنگرہ، زندگی کا اصل الاصول، فکر کا حسن، ذوقِ عمل کا سرچشمہ اور مولانا کی بنیادی شخصیت کو ان کی "داعی الی القرآن" کی حیثیت میں، ان کے حسنِ سیرت کو ذوقِ تمسک بالکتاب والسنۃ میں اور ان کی تمام اسلامی اور قومی خدمات کا سرچشمہ تعلیماتِ قرآن وسیرتِ نبوئی میں تلاش کرنا چاہیے لیکن یہاں ہمارے پیشِ نظر مقصد مولانا کی تمام اسلامی و قومی خدمات پر تبصرہ اور ان پر نظر و بحث کی محفل آراستہ کرنا نہیں۔ صرف مولانا کی دعوت الی القرآن، مولانا کے فلسفۂ عمرانیات میں علم و عملِ قرآن کی اہمیت اور تعلیم و اشاعت اور علوم و معارفِ قرآن میں مولانا کی تالیفات کے بارے میں چند ضروری اشارات قارئینِ کرام کے سامنے کرنا چاہتا ہوں۔

الہلال :

اگرچہ مولانا آزاد کی علمی و عملی زندگی کا آغاز ان کے عنفوانِ شباب کی منزل کو پہنچنے سے بھی پہلے صرف بارہ برس کی عمر میں ہو گیا تھا اور انھوں نے شعر و ادب کے ذوق کے ساتھ رسوم و بدعات کے خلاف جہاد بھی شروع کر دیا تھا لیکن کل ہند سطح پر ان کی دینی دعوت کا ظہور دانبعاث ہفت روزہ الہلال کلکتہ کی اشاعت (۱۹۱۲ء) سے ہوا۔ الہلال کا اجرار تاریخ صحافت ہی کا ایک یادگار واقعہ نہیں بلکہ وہ ایک ادبی صحیفہ، سیاسی مربی اور مسلمانوں کی تحریکِ استخلاص وطن میں اپنے برادرانِ وطن کے ساتھ بے باکانہ کودپڑنے کا داعی بھی تھا۔ بلاشبہ یہ اس کے لیے خصایص ہیں جن کا تذکرہ کرنا چاہیے اور اس حکایتِ لذیذ کو دراز سے دراز تر کر دینا ایک پسندیدہ اور مفید عمل ہے لیکن اس کی یہ تمام خصوصیات ضمنی اور ذیلی ہیں۔ اس کی پہلی اور آخری خصوصیت، اس کا مقصد اصلی اس کے سوا کچھ اور نہ تھا کہ وہ مسلمانوں کو ان کے تمام اعمال و معتقدات میں صرف کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہؐ پر عمل کرنے کی دعوت دیتا تھا۔ اس کی یہ دعوت الی القرآن اصل اور باقی سب کچھ اور تمام خصایص اس اصل

کی فرع تھے۔ الہلال کے مقصد کے بارے میں مولانا لکھتے ہیں :

"الہلال کا مقصد اصلی اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ وہ مسلمانوں کو ان کے تمام اعمال و معتقدات میں صرف کتاب اللہ اور سنّتِ رسول اللہ پر عمل کرنے کی دعوت دیتا ہے اور خواہ تعلیمی مسائل ہوں خواہ تمدّنی، سیاسی ہوں خواہ اور کچھ، وہ ہر جگہ مسلمانوں کو صرف مسلمان دیکھنا چاہتا ہے۔ اس کی صورت صرف یہی ہے کہ تَعَالَوْا اِلٰی كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ (۳ : ۵۷) اس کتاب اللہ کی طرف آؤ جو ہم اور تم، دونوں میں مشترک ہے اور جس سے کسی کو اعتقاداً انکار نہیں۔۔۔۔ اس کے سوا الہلال کی کوئی تعلیم اور کوئی مقصد نہیں۔ وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَا اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ۔ (۳۴ : ۴۱) اور اس سے بہتر کس کی بات ہو سکتی ہے جو خدا کی طرف دعوت دے اور عمل اچھے کرے اور کہے کہ میں مسلمان ہوں"۔[1]

"الہلال کی دعوت" کے عنوان سے مولانا ایک اور شذرہ میں لکھتے ہیں :

"الہلال کا دائرۂ بحث تو صرف ایک ہی ہے یعنی احیاءِ تعلیم اسلامی اور اتباع مَا جَاءَ بِهِ الْقُرْاٰنُ کی دعوت۔ ساتھ ہی اس کا عقیدہ ہے کہ اگر قرآن خدا کی کتاب ہے اور اگر اس کا دعویٰ قابلِ تسلیم ہے تو مسلمانوں کی تعلیم، پالٹیکس، اخلاق، تمدن جو کچھ ہے، اس کے اندر ہے"۔[2]

ایک مقالے میں مولانا نے الہلال کی دعوت اصلی اور خصائص متفرقہ کی نسبت فرمایا :

"الہلال صرف خبروں کے ایک ہفتہ وار اخبار اور دلچسپ مقالات و رسائل کے کسی مجموعے کا نام نہیں ہے، بلکہ وہ ایک دعوت ہے، جو قوم کو بلاتی ہے اور ایک تحریک ہے جو جماعتوں میں انقلاب و تغیر دیکھنا چاہتی ہے۔ پس آج کہ اس کی عمر کا پہلا سال ختم ہو چکا ہے اور دوسرے سال میں قدم رکھ رہا ہے، ضرور ہے کہ۔۔۔۔۔۔

---

[1] الہلال کے مقاصد اور پولیٹیکل تعلیم، الہلال، ۸ ستمبر ۱۹۱۲ء ص ۶

[2] الہلال کی دعوت (مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے مراسلے کے جواب میں) الہلال ۲۳ اکتوبر ۱۹۱۲ء ص ۲

اس پر ایک نظر ڈال لی جائے کہ اس کی گذشتہ حالت کیسی رہی اور اس کا ماضی اپنے مستقبل کے لیے کن علائم و آثار کو نمایاں کرتا ہے اس نے روزِ اوّل ہی سے اپنے لیے صرف ایک راہ اختیار کر لی ہے۔ پس اس کو اپنے اغراض و مقاصد کے لیے کسی لمبی چوڑی فہرست کی ضرورت نہ تھی، جیسی کہ بہت سے لوگوں کو ہوا کرتی ہے۔ وہ "علمی، تمدنی، اخلاقی، سیاسی، ادبی، اصلاحی وکذا وکذا کو اپنے لوح پر لکھوانے کی ضرورت نہیں سمجھتا تھا۔ اس نے الہلال کی لوح کی جگہ صرف لوحِ دل پر ایک ہی مقصد لکھ لیا تھا، یعنی "دعوت الی القرآن" یا "امر بالمعروف ونہی عن المنکر" اور یہ ایک ایسا چراغِ ہدایت اسے میسّر آگیا تھا جس سے اصلاح و دعوت کی ہر شاخ کو وہ روشن کر سکتا تھا۔ پس اس کے لیے تمدّن، معاشرت، علم، اخلاق اور سیاست کے الفاظ بالکل بے کار تھے۔ کیونکہ اس کے پاس وہ تھا جس سے وہ اپنے عقیدے میں، سب کچھ حاصل کر سکتا ہے پر جن کے پاس وہ نہیں ہے، انھیں گھر گھر کی ٹھوکریں کھانی اور دروازے دروازے کی دریوزہ گری کرنی پڑتی ہے۔ وَمَنْ لَّمْ یَجْعَلِ اللّٰہُ لَہٗ نُوْرًا، فَمَا لَہٗ مِنْ نُّوْرٍ"۔[1]

ایک اور مقالے میں مولانا نے الہلال کی اس خصوصیت پر ان الفاظ میں روشنی ڈالی ہے:

"اس نے روزِ اول ہی سے اعلان کر دیا کہ احیاء و تجدید ملّت کے لیے جس قدر تحریکیں ملک میں موجود ہیں وہ ان میں سے کسی کو بھی تنزل وانحطاط کے اصلی مرض کا کامل علاج نہیں سمجھتا، بلکہ ان میں سے اکثر اس طرح کا علاج ہیں جن کے اندر خود نئی بیماریوں کے پیدا کرنے کی ہلاکت موجود ہے۔ پس وہ ان تمام راستوں سے بالکل الگ ہو گیا جو کار و بار اصلاح و ترقی کے بیشتر سے موجود تھے اور پھر نہ تو اُس نے تعلیم کو اپنا کعبہ مقصود بنایا، نہ سیاست کو قبلۂ آمال، نہ علم کی راہنمائی

---

[1] فاتحۃ السنۃ الثانیہ (۲)، الہلال، ۹ رجولائی ۱۹۱۳ء ص ۹

قبول کی، نہ تہذیب وتمدن سے دستگیری چاہی۔ صرف یہی ایک صدا بلند کی کہ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَأَنتُمْ تَسْمَعُونَ (۸:۲۱)

مسلمانو! اللہ کی اطاعت کرو اور اُس کے رسول کے لائے ہوئے حکموں پر عمل کرو اور اس کی طرف سے گردن نہ موڑو اور تم اُس کی بھیجی ہوئی آیتیں سن رہے ہو

کیونکہ اس کو یقین ہو گیا کہ جب تک مسلمانوں کے اعتقادات و اعمالِ مذہبی کی اصلاح و درستگی نہ ہو گی اس وقت تک کوئی سعی اصلاح مفید مقصد نہیں ہو سکتی

پس اس نے اپنے مقصد کو ایک ہی مختصر جملے میں بار بار دہرایا یعنی "دعوۃ الی القرآن یا امر بالمعروف ونہی عن المنکر" اور پھر اعمالِ قومی کی ہر شاخ میں اسی اصل الاصول کو پیش نظر رکھ کر دعوت شروع کی۔"[۱]

مولانا آزاد نے الہلال کے جو یہ مقاصد قرار دیے تھے تو محض اخبار نویسی کے لیے ایک میدان کی تلاش اور اس کا اعلان نہ تھا بلکہ برسوں کے غور وفکر اور مسلمانوں کے تمام امراضِ ملی کی واقعی تشخیص اور ان کے دفع وانسداد کا ایسا علاج تھا کہ اس کے سوا چارہ اور اس سے مفر نہ تھا۔ یہ امراض اور ان کا علاج کیا تھا۔ مولانا ہی کے الفاظ مستعار لیجیے:

"آج تک ان کی تمام ناکامیوں کی علتِ حقیقی یہ رہی ہے کہ انہوں نے اپنے اعمالِ زندگی کی کسی شاخ کو "سلطانِ قرآن" کے ماتحت نہیں رکھا اور جب کبھی کوئی تحریک شروع کی یا اپنے لیے کسی پالیسی کا پروگرام مرتب کیا تو قرآنِ کریم کو اس طرح بھولے رہے، گویا اس کا نزول تاریخِ عالم کا کوئی واقعہ ہے ہی نہیں۔"[۲]

اسی مقالے میں آگے چل کر فرماتے ہیں:

---

[۱] فاتحۃ السنۃ الثالثۃ (۳) دعوۃ الی الحق و داعی الی الحق۔ الہلال، ۴ فروری ۱۹۱۴ء ص ۶۔

[۲] القسطاس المستقیم۔ مسلمانوں کی آیندہ شاہراہ مقصود کیا ہونی چاہیے؟ (۱) الہلال ۹ اکتوبر ۱۹۱۲ء ص ۶۔

"مسلمانوں کے تمام موجودہ امراض کی اصلی علت جس نے مختلف عوارض کی شکلیں اختیار کرلی ہیں، اس کے سوا کچھ نہیں کہ انہوں نے تعلیم الٰہی کے "عروۃ الوثقٰی" کو چھوڑ دیا ہے اور اس کے ساتھ مہلک بد پرہیزی یہ ہے کہ سعیٔ اصلاح و ترقی کا جو قدم اٹھایا وہ مذہب سے الگ رہ کر اٹھایا، نتیجہ یہ نکلا کہ صحت و تندرستی ہی سے محروم ہو گئے۔"[1]

اسی سلسلے میں مزید لکھتے ہیں:

"قرآن کریم صرف نماز اور روزے کے فرائض بتلانے ہی کے لیے نازل نہیں ہوا بلکہ وہ انسانوں کے لیے ایک کامل و اکمل قانونِ فلاح ہے۔ جس سے انسانی زندگی کی کوئی شے باہر نہیں۔ پس مسلمانوں کی ہر وہ پالیسی اور ہر وہ عمل جو قرآنی تعلیم پر مبنی نہ ہوگا، ان کے لیے کبھی موجب فوز و فلاح نہیں ہو سکتا۔"[2]

مسلمانوں کے اجتماعی امراض کی تشخیص اور ان کے اسباب کی جستجو کے بعد مولانا نے اس نسخۂ شفاء کا اعلان بھی کر دیا جو اُن کے نزدیک امراض کے خاتمے اور ان کے کلی استیصال کے لیے ناگزیر تھا۔ مولانا لکھتے ہیں:

"اگر تشخیص کے بعد علاج آسان ہے، اگر گزشتہ امراض کی دریافت کے بعد آیندہ کے لیے حصولِ صحت میں کوئی دشواری نہیں اور اگر صحت کی آرزو کے ساتھ مرض کے حصول کی خواہش کبھی جمع نہیں ہو سکتی تو مسلمانوں کے لیے ان کی آیندہ شاہراہِ مقصود کا سوال بالکل صاف ہے اور وہ ایک ہی ہے۔ آج تک ان کی تمام کوششیں اس لیے بارآور نہ ہوئیں کہ ان کو آگ کی تلاش نہ تھی۔ چاہیے تھا کہ چنگاریوں کو پھونکتے تاکہ آگ بھڑکتی اور تنور گرم ہو جاتا۔ لیکن وہ ہمیشہ راکھ کے ڈھیر کو پھونکتے رہے۔ اُن کی محنت میں کوئی شک نہیں مگر اس کو کیا کیجیے کہ راکھ کو پھونکنے سے آگ نہیں پیدا ہو سکتی۔

---

[1] ایضاً (۳)، ۲۳؍ اکتوبر ۱۹۱۲ء ص ۵۔

[2] ایضاً (۳)، ۲۳؍ اکتوبر ۱۹۱۲ء ص ۷۔

وناز لو نفخت بہا اضاءت
ولکن انت تنفخ فی الرماد [1]

اس سلسلے میں مولانا اپنے عقیدے کا اظہار ان لفظوں میں کرتے ہیں :

"انسانی اعمال کی خواہ کوئی شاخ ہو۔ ہم تو اُسے مذہب ہی کی نظر سے دیکھتے ہیں ، ہمارے پاس اگر کچھ ہے تو صرف قرآن ہے اس کے سوا ہم اور کچھ نہیں جانتے۔ ساری دنیا کی طرف سے ہماری آنکھیں بند ہیں اور تمام آوازوں سے کان بہرے ہیں۔ اگر دیکھنے کے لیے روشنی کی ضرورت ہے تو یقین کیجیے کہ ہمارے پاس تو سراج منیر کی بخشی ہوئی ایک ہی روشنی ہے۔ اس سے ہٹا دیجیے گا تو بالکل اندھے ہو جائیں گے ۔

کِتَابٌ اَنْزَلْنَاهُ اِلَیْکَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ" (۱:۱۴) — قرآن ایک کتاب ہے جو تم پر نازل کی گئی، اس لیے کہ انسان کو تاریکی سے نکالے اور روشنی میں لائے ۔

ہمارے عقیدے میں تو ہر وہ خیال جو قرآن کے سوا کسی اور تعلیم گاہ سے حاصل کیا گیا ہو، ایک کفر صریح ہے۔۔۔۔۔ اسلام انسان کے لیے ایک جامع اور اکمل قانون لے کر آیا اور انسانی اعمال کا کوئی مناقشہ ایسا نہیں جس کے لیے وہ حکم نہ ہو۔ ۔۔۔۔۔

مسلمانوں کی اخلاقی زندگی ہو یا عملی، سیاسی ہو یا معاشرتی، دینی ہو یا دنیادی، حاکمانہ ہو یا محکومانہ، وہ ہر زندگی کے لیے اکمل ترین قانون اپنے اندر رکھتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ دنیا کا آخری اور عالمگیر مذہب نہ ہو سکتا۔ وہ خدا کی آواز اور اس کی تعلیم گاہ خدا کا حلقہ درس ہے جس نے خدا کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا، وہ پھر کسی انسانی دستگیری کا محتاج نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے ہر جگہ اپنے تئیں امام مبین، حق الیقین نور و کتاب مبین تبیاناً لکل شئی، بصائر للناس، ہادی و ہادی الی السبیل، جامع ضراب و امثال، بلاغ للناس، حاوی بحر و بر اور اسی طرح کے ناموں سے یاد کیا ہے۔ اکثر موقعوں

---

[1] القسطاس المستقیم ص۳، الہلال ۲۳ر اکتوبر ۱۲ء ص ۷ ۔

پر کہا ہے کہ وہ ایک روشنی ہے اور روشنی جب نکلتی ہے تو ہر طرح کی تاریکی دور ہو جاتی ہے، خواہ مذہبی برائیوں کی ہو خواہ سیاسی۔

قَدْ جَآءَكُم مِّنَ اللَّهِ نُورٌ وَّ كِتَابٌ مُّبِينٌ۔ يَهْدِي بِهِ اللَّهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهُ سُبُلَ السَّلَامِ وَيُخْرِجُهُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ وَ يَهْدِيهِمْ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ۔ (۵ : ۱۸)

بے شک تمہارے پاس اللہ کی طرف سے روشنی اور ہر بات کو بیان کرنے والی کتاب آئی ہے۔ اللہ اس کے ذریعے سلامتی کے راستوں پر ہدایت کرتا ہے اس کی، جو اس کی رضا چاہتا ہے اور اس کو ہر طرح کی گمراہی کی تاریکی سے نکال کر ہدایت کی روشنی میں لاتا ہے اور صراطِ مستقیم پر چلاتا ہے۔[۱]

اسی مقالے میں آگے چل کر مولانا نے دو ٹوک لفظوں میں اپنے اس اعتقاد کا اظہار پھر کیا ہے:

"ہمارا عقیدہ ہے کہ جو مسلمان اپنے کسی عمل و اعتقاد کے لیے بھی اس کتاب کے سوا کسی دوسری جماعت یا تعلیم کو اپنا رہنما بنائے وہ مسلم نہیں بلکہ شرک فی صفات اللہ کی طرح شرک فی صفات القرآن کا مجرم اور اس لیے مشرک ہے وَالْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي هَدَانَا لِهَٰذَا وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَا أَنْ هَدَانَا اللَّهُ (۷: ۴۳)"[۲]

ایک اور مقالے میں قرآن حکیم کی جامعیت اور کمالِ تعلیم پر خدائے تعالیٰ کی وحدتِ ذات و صفات سے استدلال کیا ہے:

"ہمارا عقیدہ ہے کہ جس طرح اسلام کا خدا اپنی ذات و صفات میں وحدہٗ لاشریک ہے۔ کوئی ہستی اور وجود اس میں شریک نہیں۔ اسی طرح اس کا "قرآن کریم" اپنی جامعیت اور کمال تعلیم میں "وحدہٗ لاشریک" ہے۔"[۳]

اس سلسلے میں انہوں نے اپنے اعتقاد کا اظہار بھی کر دیا کہ:

"ہمارا اعتقاد ہے کہ ہر وہ انسانی عمل جو تعلیم الٰہی کی ہدایت بخشی سے خالی ہے، کبھی

---

[۱] الہلال کے مقاصد اور پولٹیکل تعلیم، الہلال ۸ ستمبر ۱۹۱۲ء، ص ۵ [۲] الہلال کے مقاصد اور پولٹیکل تعلیم، الہلال ۸ ستمبر ۱۹۱۲ء، ص ۷ [۳] القسطاس المستقیم ۔۔۔ (۱)، الہلال، ۹ اکتوبر ۱۹۱۲ء، ص ۷۔

فوز و فلاح نہیں پا سکتا۔ اگر ہم اپنی دعوت کی خوبیاں ثابت نہ کر سکیں تو کچھ حرج نہیں کیونکہ اس کے لیے یہی ایک خوبی کافی ہے کہ اوروں کی دعوت انسانوں کی طرف ہے اور اس کی پکار تعلیم الٰہی کی طرف۔

وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّ قَالَ اِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ۔ (۴۱: ۳۳)

اور اس سے بہتر اور کس کی پکار ہو سکتی ہے جس نے اللہ کی طرف بلایا، اعمال نیک انجام دیے اور اپنے تئیں کسی انسانی نسبت کی طرف نہیں، بلکہ خدا کی طرف منسوب کر کے کہا کہ میں صرف "مسلم" ہوں۔" [1]

مولانا کے نزدیک مسلمانوں کے تمام اجتماعی و ملی مسائل کا حل اُن کے فکر و عمل کے تمام امراض کا علاج صرف قرآن حکیم کی تعلیمات اور اسوۂ نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں ہے۔ اس لیے انہیں زندگی میں پیش آنے والے اپنے تمام سوالوں کا جواب اسی امامِ مبین، تبیاناً لکل شئی سے پوچھنا چاہیے اور اپنے ہر اختلاف و نزاع کے فیصلے کے لیے صرف اسی ایک حاکمِ ناطق کی طرف رجوع کرنا چاہیے کہ جس کے سوا نہ کوئی کچھ بتانے والا ہے نہ ہدایت دینے اور راہنمائی کرنے والا ہے اور نہ جس کے فیصلے کے سوا کسی کا فیصلہ اس قابل ہو سکتا ہے کہ بے چون و چرا اس کے سامنے سر اطاعت و تسلیم جھکا دیا جائے۔ مولانا فرماتے ہیں :

"ہم تو دنیا کی ہر شئے کو مذہب ہی میں ڈھونڈھتے ہیں اور پھر اس کے بعد نہیں جانتے کہ دنیا میں اور کیا کہا جاتا ہے؟ ہمارے ہاتھ میں قرآن کریم ایک امامِ مبین، تبیاناً لکل شئی، بیان للناس، نور و کتاب مبین اور انسان کے ہر اختلاف و نزاع کے لیے ایک حاکمِ ناطق ہے اور پھر اس کا عملی نمونہ اور وجود ظلی اس کے حامل و مبیّن کی زندگی کے اعمال ہیں کہ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ" [2]

مولانا آزاد نے دعوتِ الہلال کے ان مبادی و خصایص کی وضاحت کے بعد صاف صاف

---

[1] ایضاً (۴) الہلال ۲ نومبر ۱۹۱۲ء ص ۵ [2] الامر بالمعروف والنہی عن المنکر، الہلال، ۱۱ اگست ۱۹۱۲ء ص ۵، ۶

اعلان کر دیا کہ مسلمانوں کے فکر و عمل کی تمام گمراہیوں کا انسداد، تمام امراضِ ذہن و قلب کا علاج اور ہر قسم کے مسائل قومی و ملی کا حل صرف اسی نور و کتاب کی راہنمائی میں ہے جسے قرآن حکیم کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اس لیے مسلمانوں کا کام اس کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتا کہ وہ ہر طرف سے اپنی آنکھیں بند کر کے اپنے ہاتھ کو ہادیٔ مطلق کے ہاتھ میں دے دیں۔ اسی طرح مسلمان اپنے کھوئے ہوئے وقار کو حاصل کر سکتے ہیں۔ مولانا لکھتے ہیں:

"پس اگر مسلمان زندگی حاصل کر سکتے ہیں تو مسلمان بن کر، ہندو یا مسیحی بن کر نہیں، آپ کے ہاں اگر شمع کافوری جل رہی ہے تو آپ کو کسی فقیر کے جھونپڑے سے اس کا ٹمٹماتا ہوا دیا چرانے کی کیا ضرورت ہے؟"[۱]

اسی مقالے میں مولانا آگے چل کر لکھتے ہیں:

"ان کا کام صرف یہ ہے کہ اتباعِ کلمات اللہ و جمیع ماجاء بہ القرآن کے لیے تیار ہو جائیں اور اپنے تئیں تمام انسانی تعلیموں کے اتباع و محاکات کے ولولوں سے خالی کر کے صرف اس ایک ہی معلم کی تعلیم پر چھوڑ دیں۔"[۲]

کچھ اور آگے چل کر مسلمانوں کے لیے قسطاسِ مستقیم کو ان الفاظ میں واضح کیا ہے:

"ان کی خواہش اور پالیسی صرف اتباعِ قرآن ہو۔ وہ اس تنکے کی طرح جس کو کسی بحرِ طوفان خیز میں ڈال دیا گیا ہو، اپنے تئیں تعلیم الٰہی کے سمندر میں چھوڑ دیں، جس طرف وہ چاہے، لے جائے اور جس کنارے سے چاہے، انہیں لگا دے۔ جب خدا ان کا تمام بوجھ اپنے سر لیتا ہے تو وہ خود اپنے کاندھوں کو کیوں تھکاتے ہیں۔"[۳]

الہلال کی تعلیم و مقاصد کے سلسلے میں حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ کے افکار و افادات کو قدرے تفصیل کے ساتھ اس لیے پیش کیا تاکہ معلوم ہو جائے کہ بیسویں صدی میں الہلال کی دعوت "اتباع کلمات اللہ و جمیع ماجاء بہ القرآن" کے سوا کچھ اور نہ تھی۔ انہوں نے اپنی تحریر و انشاء کی بہترین صلاحیتوں کو

---

[۱] القسطاس المستقیم ..... (۱) الہلال، ۹ر اکتوبر ۱۹۱۲ء، ص ۸ [۲] ایضاً (۳) ایضاً ۹ر اکتوبر ۱۹۱۲ء، ص [illegible]

اسی دعوت کے عام کرنے میں صرف کیا۔ انہوں نے مسلمانوں کو اسی کی دعوت دی کہ کلامِ الٰہی کی رہنمائی کو چھوڑ کر انہیں سیاسی وسماجی اور تعلیمی وتمدنی مسائل میں بھی کسی اور تعلیم گاہ کو اپنا قبلہ ر مقصود نہیں بنانا چاہیے اور صرف ایک امام مبین، بصائرُ و ہدایت للناس اور ہادی الی السبیل سے رُخ موڑ کر کسی اور مدعیٔ تعلیم وسیاست کو اپنے معاملاتِ قومی و ملی کی باگ ڈور نہ سونپ دینی چاہیے۔

الہلال کے ایک نمبر میں مولانا نے لکھا تھا کہ الہلال میں :

"ایک باب مذاکرۂ علمیہ ہے۔ اس کے نیچے علمی اور مذہبی تحقیقات کے مضامین ایک خاص اصول ورنگ کے درج کرنا چاہتے ہیں۔ علی الخصوص ان غلط فہمیوں کی نسبت جنھوں نے برسوں سے قرآن وحدیث کے اصلی حقائق ومعارف پر پردے ڈال دیے ہیں۔"[۱]

یہ تو الہلال کے ایک خاص باب کا عنوان اور اس کے مندرجات کی نوعیت تھی۔ جہاں تک مولانا کے اندازِ فکر اور ذوق ورجحان کا تعلق ہے تو الہلال کے تمام ابواب ومقالات، سوانح و تراجم، مباحث و مذاکرات حتیٰ کہ احیائے ملتِ اسلامیہ کی تمام کوششوں میں یہی ایک دعوت اور تعلیم جلوہ نگن تھی، صرف مناظر ومظاہر مختلف تھے۔ یہ تعلیم اور دعوت نہ صرف الہلال کی تعلیم ومقاصد کا بنیادی نقطہ ہے بلکہ مولانا کی فکر وسیرت کے خصایص ومحاسن بھی ہمیں ان کے انہی اعتقادات اور علمی ودینی افادات میں تلاش کرنا چاہیے۔ یہی مولانا کی شخصیت کی سب سے بڑی خصوصیت تھی؛ یہی ان کی زندگی کی تمام مشغولیتوں کا مرکز اور ان کے تمام افکار وافادات کا سرچشمہ تھا۔ چنانچہ ہم ایک نظر میں یہ دیکھ سکتے ہیں کہ انہوں نے البیان والبصائر کے اجراء کا فیصلہ کیا تو انہی مقاصد کے لیے۔ جماعت حزب اللہ کا قیام عمل میں آیا تو صرف سلطان قرآن کی سلطنت کے قیام کی منادی کے لیے، دارالارشاد کا وجود نقش پذیر ہوا تو اسی دعوت کے درس وتربیت کے لیے، رانچی کی نظر بندی کے زمانے میں تصنیف وتالیف کی سب سے بڑی مصروفیت اسی حاکم ناطق کے ترجمہ وتفسیر کا شغل تھا۔

---

[۱] شذرات، الہلال، ۱۱ راگست ۱۹۱۲ء ص ۱

علی پور سنٹرل جیل میں غور و فکر اور تصنیف و تالیف کا موضوع یہی البیان والبصائر تھا، میرٹھ کا زمانۂ اسارت اسی کے عشق میں کر دیں بدلتے اور تعلیم و اشاعت قرآن کے لیے ایک ادارے کے قیام کا منصوبہ بنانے میں گزرا تھا۔[1] احمد نگر جیل کی شب ہائے دراز میں فکر و تدبر اور اصلاح و تزئین کا موضوع ترجمان القرآن تھا۔[2] اور زندگی کے آخری لمحوں تک جو ذوق جوان رہا اور جس کے عشق کے لیے کوئی زوال نہ تھا وہ یوسفِ مقصود قرآن حکیم اور سیرتِ نبوی کے سوا کچھ اور نہ تھا۔[3] اس لیے نامناسب نہ ہوگا کہ مولانا آزاد علیہ الرحمۃ کے عزائم وقت اور افکار و مشاغلِ علمیہ میں ان خصائص کی نشان دہی کر دی جائے۔

البلاغ:

الہلال اور البلاغ میں اختلاف صرف اسم کا ہے مسمّی کا نہیں۔ وہی ایک صہبائے قرآنی تھی جو پہلے اہلِ میخانہ کو الہلال کے جام میں ملتی تھی اب البلاغ کے جام میں پیش کی جا رہی تھی۔ وہی حروف و سواد، وہی صورت و آہنگ، وہی پیام و دعوت اور وہی داعی الی القرآن والسنت تھا جو اپنی درد انگیز و پُرزور آواز میں مسلمانوں کو ان کی تباہ حالیوں اور بدبختیوں کا مرثیہ سنا رہا تھا، ان کی تکلیف و نامرادی کے اسباب و علل بتا رہا تھا اور ان کی نئی زندگی کے قیام کے لیے انہیں قرآن حکیم کے اصلی و حقیقی معارف سے آشنا کر رہا تھا اور حضرت امام مالکؒ کے الفاظ میں انہیں اسی نسخۂ کیمیا کے استعمال کی ترغیب دے رہا تھا جس سے پہلوں نے شفا پائی تھی اور پچھلوں کی نشدّت کا دار و مدار بھی اسی کے استعمال پر تھا۔ البلاغ کے پہلے نمبر ہی میں مولانا نے فرما دیا تھا:

"اگر ایک شخص مسلمانوں کی تمام موجودہ تباہ حالیوں اور بدبختیوں کی علتِ حقیقی دریافت کرنا چاہے اور ساتھ ہی یہ شرط بھی لگا دے کہ صرف ایک ہی علت اصلی ایسی

---

[1] دیباچہ ترجمان القرآن، جلد اول، محولہ بالا، ص ۶۔ ۷۔ ۵۲۔

[2] استدراک ترجمان القرآن جلد اول (از محمد اجمل خاں) دہلی، ساہتیہ اکادیمی، ۱۹۶۴ء، ص ۵۴۷۔

[3] مولانا ابوالکلام آزاد کی مذہبی زندگی، مضمون مولانا سعید احمد اکبرآبادی، مشمولہ "مولانا آزاد اور ان کے ناقد"، مرتبہ ایم اے شاہد، کراچی ۱۹۸۱ء، ص ۶۶ و حضرت مولانا آزاد کی اسلامی سیرت (مضمون) از مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، مشمولہ "مولانا آزاد اور ان کے ناقد"، محولہ بالا، ص ۷۵۔

بیان کی جائے جو تمام علل واسباب پر حاوی و جامع ہو، تو اس کو بتایا جا سکتا ہے کہ علمارِ حق و مرشدین صادقین کا فقدان اور علمارِ سوء و مفسدین و جالین کی کثرت ــــ

ربنا اننا اطعنا سادتنا وکبراءنا فاضلونا السبیل۔

اور پھر اگر وہ پوچھے کہ ایک ہی جملہ میں اس کا علاج کیا ہے ؟ تو اس کو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ میں جواب ملنا چاہیے کہ " لا یصلح اٰخر ھذہ الامۃ الا بما صلح بہ اولہا" یعنی امت مرحومہ کے آخری عہد کی اصلاح کبھی نہ ہو سکے گی، تاوقتیکہ وہی طریق اختیار نہ کیا جائے جس سے اس کے ابتدائی عہد نے اصلاح پائی تھی اور وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ قرآن حکیم کے اصلی و حقیقی معارف کی تبلیغ کرنے والے مرشدین صادقین پیدا کیے جائیں"۔[۱]

دعوت الہلال اور اس کے نتائج :

اس مقام پر پہنچ کر الہلال اور البلاغ کی دعوتِ قرآنی کے نتائج پر بھی نظر ڈال لیجیے : بیج بویا جاتا ہے تو توقع کی جاتی ہے کہ قدرت نے اس میں نشوونما کی جو استعداد رکھی ہے، وہ ہدایت پائے گی اور سرسبز پتیوں اور شاخوں کا ظہور و انبعاث ہوگا۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ مولانا نے تعلیم قرآن کا جو تخم الہلال والبلاغ کے حروف و سواد کے ذریعے مسلمانوں کے دلوں کی سرزمین میں بویا تھا اور اپنے اندر نشوونما کی قومی استعداد رکھتا تھا برگ و بار پیدا نہ کرے۔ بلاشبہ اس نے برگ و بار پیدا کیے اور مسلمانوں میں ایک نئی زندگی کے تمام آثار و علائم پیدا ہو گئے۔ تذکرہ کے مقدمہ میں "عام مذہبی انقلاب" کے زیر عنوان فضل الدین احمد لکھتے ہیں :

"الہلال کا سب سے بڑا کارنامہ جو ہمیشہ تاریخ میں یادگار رہے گا، وہ پائیدار مذہبی انقلاب ہے جو یکایک مسلمانوں میں اس کی دعوتِ حق سے پیدا ہو گیا۔ لاکھوں، کروڑوں مسلمان ہمیشہ قرآن شریف پڑھتے پڑھاتے رہتے ہیں مگر قرآن کی اصلی حقیقت سب سے پہلے اسی نے آشکارا کی اور یکایک سب کے دل میں یہ بات اتر گئی کہ ہماری دینی و دنیوی

---

[۱] دارالارشاد، البلاغ ۱۲ نومبر ۱۹۱۵ء ص ۱۵-۱۶

ترقی کی صرف وہی راہ صحیح ہو سکتی ہے جو اس کی راہنمائی سے کھلی ہو۔ رسمی طور پر یہ بات پہلے بھی کہی جاتی تھی لیکن اس طرح کسی نے نہیں بتلائی تھی کہ جاہل سے لے کر عالم تک سب کے دلوں کو مسحور کر لے اور سب بے اختیار ہو کر اس کی طرف کھنچ جائیں۔ اس نے نہ صرف اس کی پکار بلند کی بلکہ قومی زندگی کی ہر بات میں قرآن کی تعلیم دنیا کے سامنے پیش بھی کر دی اور ہر طرف سے ہٹا کر قوم کو صرف مذہب کی سچی راہ پر لگا دیا۔ سیاست، معاشرت، تعلیم، ساری باتوں کی اصلی بنیاد صرف مذہب اور قرآن کی تعلیم قرار پا گئی۔ گو ابتداء میں بہت سے لوگوں نے مخالفتیں بھی کیں لیکن رفتہ رفتہ سب نے اس کے آگے سر جھکا دیا اور آج تمام مسلمانوں پر جو رنگ چھایا ہوا ہے، خواہ اس کا ظہور سیاسی مذاہب میں ہو یا کسی دوسری شکل میں مگر سب چل رہے ہیں اسی راہ پر۔"

فضل الدین احمد نے ان جماعتوں کی نشاندہی بھی کر دی ہے جو الہلال کی دعوت سے متاثر ہوئیں اور اس انقلابِ حالت کی تصویر بھی کھینچ دی ہے جو دعوت الہلال سے نقش پذیر ہوئی تھی وہ لکھتے ہیں۔

"سب سے زیادہ یادگار اور تعجب انگیز اثر اُس نے دو جماعتوں پر ڈالا اور یہی تمام جماعتیں تمام قوم کے لیے بمنزلہ اصل و بنیاد کے ہیں یعنی علماء و مشائخ کا گروہ اور انگریزی تعلیم یافتہ جماعت۔ اگر الہلال شائع ہو کر اور کوئی کام نہ کرتا۔ ایک عالم، ایک پیر، ایک بااثر جدید تعلیم یافتہ شخص کو اس رنگ میں رنگ دیتا جس میں اس نے تمام قوم کو رنگ دیا ہے، تو صرف یہی کارنامہ اس کی انقلابی قوت کے اعتراف کے لیے کافی تھا۔ علماء و مشائخ کا گروہ جو اپنے مدرسوں اور حجروں سے جھانک کر بھی دنیا کی حالت پر نظر نہیں ڈالتا تھا۔ الہلال نے ان کو یکایک نکال کر جدوجہد کے میدانوں میں کھڑا کر دیا اور ان میں سے ہر شخص نے محسوس کر لیا کہ ہم اپنے اصلی فرض کو آج تک بھولے ہوئے تھے۔ جدید تعلیم یافتہ جماعت کا یہ حال ہوا کہ یا تو یہ گروہ مذہب کے نام سے متوحش تھا یا اب ہزاروں سر خدا کے آگے جھک گئے اور بعض کا تو یہ حال ہوا کہ بڑے بڑے عابدوں، زاہدوں کو اپنے پیچھے چھوڑ دیا۔ شب و روز قرآن کی صدائیں ان کی

زبانوں سے نکلنے لگیں۔ اس بارے میں جیسے جیسے عجیب واقعات دیکھے اور سنے گئے ہیں اور الہلال کے ایک ایک مضمون بلکہ ایک ایک سطر نے جیسے جیسے ہوش ربا اثر لوگوں پر ڈالے ہیں، ان کو اگر بیان کیا جائے تو ایک پورا رسالہ بن جائے''۔ لہ

تاریخ مسلمانانِ ہند و پاکستان کے دورِ آخر میں حضرت علامہ سید سلیمان ندوی علیہ الرحمۃ کی شخصیت اپنے خصائص علم و فکر کے لحاظ سے ایک نادرِ روزگار شخصیت تھی۔ اگرچہ ان کی علمی زندگی کا آغاز اس کے انجام سے بہت زیادہ شاندار تھا۔ ان کی زندگی کے آخری شب و روز جن صحبتوں میں بسر ہوئے اس کے بعد ان کے فیضانِ علم و تحقیق کی بخشائشوں کا وہ عالم رنگ و بو باقی نہیں رہا۔ مرحوم کو مولانا نے ہمیشہ "اخی" اور "اخی العزیز" کے الفاظ سے مخاطب کیا اور حضرت علامہ مرحوم کے نکتہ چین قلم اور زبان نے مغایرت اور معاصرت کی شکر رنجی کا ثبوت پیش کرنے میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔ لیکن ہمیں اعتراف کرنا چاہیے کہ جہاں انہوں نے مولانا کی خدمات علم و عمل کا اعتراف کیا ہے وہاں انہوں نے حروف و سواد پر "ذاتی رنجش" کی پرچھائیں بھی نہیں پڑنے دی ہے۔ الہلال کی خدمتِ قرآن کے بارے میں حضرت سید صاحب لکھتے ہیں :

''اس میں کوئی شبہ نہیں کہ نوجوان مسلمانوں میں قرآنِ پاک کا ذوق مولانا ابوالکلام کے الہلال والبلاغ نے پیدا کیا اور جس اسلوبِ بلاغت، کمالِ انشا پردازی اور زورِ تحریر کے ساتھ انہوں نے انگریزی خواں نوجوانوں کے سامنے قرآنِ پاک کی ہر آیت کو پیش کیا۔ اس نے ان کے لیے ایمان و یقین کے نئے نئے دروازے کھول دیے اور ان کے دلوں میں قرآن پاک کے معانی و مطالب کی بلندی اور وسعت کو پوری طرح نمایاں کر دیا''۔ ۲ہ

حضرت سید صاحب نے بیسویں صدی میں تاریخ دعوتِ قرآنی کے جس پہلو کی طرف اشارہ کیا ہے وہ تاریخ مسلمانانِ ہند پاکستان کے انقلابِ فکری کا بہت اہم موضوع ہے اور اس انقلاب میں مولانا آزاد اور ان کے الہلال کی خدمات کا اعتراف وقت کے تمام اکابر اور اہل نظر نے کیا ہے لیکن

لہ تذکرہ، دہلی، ساہتیہ اکادیمی، ۱۹۶۸ء ص ۱۴۳

۲ہ ترجمان القرآن (مقالہ مشمولہ "ابوالکلام آزاد" مرتبہ عبداللہ بٹ)، ص ۸۰

حضرت سید صاحب کا یہ اعتراف تو الہلال کے خاص موضوع اور دعوت کے متعلق تھا۔ الہلال میں دعوت الی القرآن کے سوا جو کچھ تھا وہ بھی اپنے اندر دعوت اور تمسک بالکتاب کے جو خصایص اور کشش رکھتا تھا اس کی دلربائیوں پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔ اس سلسلے میں حضرت علامہ مولانا محمد حنیف ندوی مدظلہٗ کا یہ بیان کافی ہے، وہ لکھتے ہیں :

"آج جس قدر بولنے والی زبانیں، خود دارانہ انداز میں سوچنے والے دماغ اور اسلامیات پر لکھنے والے قلم ہیں، ان سب کی تعمیر و تربیت میں الہلال نے بڑا حصہ لیا ہے۔ ان سب کو گویائی اور صحیح اندازِ فکر الہلال نے بخشا ہے۔ اس کی اشاعت اور اس کے یقین پرور مقالوں سے نفسیاتی طور پر اس قسم کی فضا پیدا ہو گئی کہ لوگوں نے پھر سے اسلامی علوم و معارف اور اسلامی تاریخ و رجال کو عزت و توقیر کی نظروں سے دیکھنا شروع کر دیا، بلکہ یہ شوق پیدا ہوا کہ اسی انداز میں از سرِ نو تمام تنظیماتِ اسلامیہ کو مرتب کیا جائے۔ مولانا نے اس میں اگرچہ ہر نوع کے مضامین لکھے اور ادبی، ثقافتی، تاریخی اور سیاسی میدانوں میں اپنی جولانیٔ طبع کے جوہر دکھائے مگر قرآن کی آیات کی تفسیر اور اس کے موزوں استعمال میں آپ نے جو جدت پیدا کی وہ آپ کی مایۂ ناز خصوصیت ہے، آپ نے مضامین آیاتِ قرآن کو اس طریق سے استعمال کیا کہ ان میں ایک نئی معنویت پیدا ہو گئی۔" [۱]

البیان والبصائر

الہلال میں چونکہ مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کے متعدد گوشے اور فکر و راہنمائی کے لیے مسلمانوں کی علمی و عملی زندگی کے بہت سے مسائل تھے اور ایک ہفتہ وار صحیفہ اپنے صفحات کی زیادہ سے زیادہ گنجائش کے باوجود صرف ایک دعوت کے لیے وقف نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لیے دعوتِ قرآن کے موضوع کا خاص ذوق رکھنے والوں کی راہنمائی اور تعلیم کے لیے ایک ایسے قرآنی علمی مجلہ کی ضرورت تھی جو صرف اسی دعوت اور درس و تعلیم کے لیے وقف ہو اور جو طبائع الہلال کے عام دعوتی اسلوب سے استفادے کے ساتھ موضوع کا علمی مطالعہ بھی کرنا چاہیں۔ ان کے ذوقِ قرآنی کی تسکین کا سامان فراہم ہو جائے۔

---

[۱] چند خیالات (مقالہ مشمولہ "ابوالکلام آزاد" بحوالہ بالا) ص ۱۶۹ - ۱۶۸

البیان کے اجراء کا فیصلہ اسی مقصد سے کیا گیا تھا۔ الہلال کی پہلی جلد کی دوسری سہ ماہی میں الہلال میں مولانا ان الفاظ میں اس کا اعلان فرماتے ہیں :

> "البیان" ــــ دفتر الہلال کا ماہوار مصوّر رسالہ
> جس کا اصلی موضوع یہ ہوگا کہ قرآن کریم اور اس کے متعلق تمام علوم و معارف پر تحقیقات کا ایک نیا ذخیرہ فراہم کرے اور ان موانع و مشکلات کو دور کرنے کی کوشش کرے جن کی وجہ سے موجودہ طبقہ روز بروز قرآن کریم کی تعلیمات سے ناآشنا ہوا جاتا ہے"۔[1]

اور جب مولانا نے البصائر نکالنے کا فیصلہ اعلان کیا تو منجملہ دیگر مقاصد کے قرآن حکیم کے تمام علوم و معارف پر تحقیقات اور تعلیم و اشاعت کا یہ منصوبہ اس میں بھی موجود تھا۔

اور جس طرح رسالہ کا نام البیان، قرآن کی آیت ہٰذا بیان للناس وہدی وموعظۃ للمتقین (۳ : ۱۳۸) سے ماخوذ تھا اسی طرح "البصائر" کا نام بھی ہٰذا بصائر للناس وہدی ورحمۃ لقوم یوقنون (۴۵ : ۲۰) سے مقتبس تھا۔ اس رسالے کے مقاصد کے تعارف میں اس کے اصلی و حقیقی مقصدِ واحد کا تعارف ان الفاظ میں کراتے ہیں :

> "اس سے مقصود یہ ہے کہ مسلمانوں کے سامنے بدفعہ واحدہ قرآن کریم کو مختلف اشکال و مباحث میں اس طرح پیش کیا جائے کہ عظمتِ کلامِ الٰہی کا وہ اندازہ کر سکیں"۔[2]

البصائر، شوال ۱۳۳۱ھ (مطابق اکتوبر ۱۹۱۳ء) سے جاری کرنے کا ارادہ تھا۔ اس کے لیے مشینیں منگوالی گئی تھیں، مشین روم تیار ہوگیا لیکن موٹر نہ لگنے کی وجہ سے تاخیر ہوئی تو ذیقعدہ سے البصائر کے اجراء کا اعلان کیا۔[3] اس کے بعد بھی چند در چند موانع پیش آتے رہے، اور رسالہ

---

[1] اشتہار "البیان"، الہلال ۱۶ر اکتوبر ۱۹۱۲ء بالمقابل صفحہ ۱۶

[2] ۱۹۱۳ء میں الہلال کے متعدد شماروں میں البصائر کا اشتہار آتا رہا ہے مثلاً ۳۰ر جولائی، ص ۲، ۲۰ر اگست ص ۱۲، ۲۴ر ستمبر، ص ۲۰

[3] البصائر، (اعلان)، الہلال، ۸ر اکتوبر ۱۹۱۳ء، ص ۲۔

کا اجرا عمل میں نہ آسکا۔ مولانا نے ۷ ار دسمبر ۱۹۱۳ء کے شمارے میں بجواب مراسلہ حکیم غلام غوث طبیب خان پور (ریاست بہاولپور) تفصیل کے ساتھ ان موانع کا ذکر کیا ہے۔ ان کے دہرانے کی چنداں ضرورت نہیں لیکن اس رسالہ کے اجرا سے مولانا کے پیشِ نظر مقاصد اور قرآن حکیم کی تعلیم و اشاعت کے سلسلے میں مولانا کے جن کے عزائم پر روشنی پڑتی ہے وہ مولانا کی سیرت اور ان کے معتقدات کا خاص حصہ ہیں، اس لیے ان کا مطالعہ خالی از افادہ نہیں۔ مولانا لکھتے ہیں:

"کسے معلوم ہے کہ کتنے دلولے ہیں جو اُٹھتے ہیں اور انہیں دل سے زبان تک پہنچنے کی مہلت بھی نہیں دی جاتی کہ وقت دوسرا اور موسم موافق نہیں:

کہ اہلِ شوق عوام اند گفتگو عربی ست

لیکن ایک مخصوص دینی رسالے کے خیال کو ضبط نہ کر سکا کہ ضرورت اشد شدید نظر آئی۔ الہلال میں جب کبھی کسی دینی و علمی موضوع پر کچھ لکھتا ہوں تو قلت ضخامت و تنوع مطالب کے خیال سے قدم قدم پر دامن الجھتا ہے اور مجبوراً ارادوں کو ملتوی کر دینا پڑتا ہے۔ سب سے بڑی مقدم شے یہ ہے کہ قرآنِ حکیم کے متعلق بے اختیار جی چاہتا ہے کہ نہایت کثرت سے ہر پہلو پر بحث کی جائے اور صدہا مباحث و معارف ہیں جو اس کے متعلق پیش نظر ہیں بلکہ بہت سے بصورت تحریر مدوّن بھی ہو چکے ہیں مگر ان کی اشاعت کا کوئی ذریعہ نہیں۔

ضرورت ہے کہ ایک ہی وقت میں قرآنِ حکیم کو مختلف اشکال بحث و معارف میں اس طرح پیش کیا جائے کہ اس کے جمالِ عظمت کا نظارہ عام ہو جائے۔

غرض کہ انہی خیالات کی بنا پر پہلے باسم البیان اور پھر البصائر اس کا اعلان کیا گیا ارباب تجربہ و کار جانتے ہیں کہ اس قسم کے کاموں کے لیے تحریر مقالات و تالیف مضامین سے زیادہ صرف وقت کی چیز محض ترتیب اور اس کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ میں نے البصائر کا اعلان تو کر دیا کہ کسی نہ کسی طرح اس کے لیے بھی وقت نکال لوں گا لیکن پھر اپنی حالت کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ موجودہ اشتغال نے جو حالت مصروفیت و انہماک کی کر رکھی ہے۔ اب وہ اس آخری درجہ تک پہنچ گئی ہے کہ اگر تھوڑا سا بھی کام اپنے ذمہ اور لے لیا تو کام کسی نہ کسی طرح ہو رہے گا لیکن ساتھ ہی رات کے چند گھنٹے جو آرام کے بمشکل میسر آ جاتے ہیں، ان سے بھی محروم ہو جاؤں گا ..... پس کسی قدر متوقف ہوا کہ اگر

الہلال کے لیے نہیں تو کم از کم البصائر ہی کے لیے اتنی اعانت میسر آجائے کہ کم از کم اس کی ترتیب اور ذمہ داری ہی سے سبکدوش ہو جاؤں۔ اسی فکر و انتظار میں ادھر کئی مہینے صرف ہو گئے لیکن بالآخر نتیجہ یہی نکلا کہ اپنے سوا نہ کسی اور کا انتظار کیجیے، اور نہ یاس بنیاد امیدوں کا اپنے دل کو مدفن بنایئے۔

یہی سبب ہے کہ البصائر کا اعلان الہلال میں روک دیا گیا کہ اس بارے میں احباب کرام سے میری شرمندگی حد تحمل سے گزر چکی تھی"۔[۱]

اگرچہ اس وقت صرف اعلان ہی کا گیا تھا۔ عزائم پر موانع کا اثر اور مایوسی کی پرچھائیں نہ پڑی تھی، مولانا فرماتے ہیں:

"میں نے البصائر کا اعلان کیا ہے تو ان شاء اللہ یہ اعلان کبھی ذلیل و شرمندہ نہ ہوگا۔ بغیر تعین وقت کے کہتا ہوں کہ جلد سے جلد البصائر کو جس کا اعلان ہو چکا ہے، اور وہ بھی جس کا اعلان نہیں ہوا ہے، پیشکش ارباب ذوق و بصیرت کروں گا"۔[۲]

حزب اللہ

۱۹۱۳ء میں جب مولانا نے جماعت حزب اللہ کے قیام کا اعلان کیا تو دراصل اس کا مقصد قیام ملت کے لیے احیائے کتاب و سنت اور اتباع شریعت مطہرہ کی ایک دعوت عام کا اعلان تھا۔ حزب اللہ کے نام سے مولانا جس قسم کی جماعت قائم کرنا چاہتے تھے۔ اس پر الہلال کے پانچ نمبروں میں نہایت تفصیل کے ساتھ انہوں نے روشنی ڈالی ہے[۳] خصوصاً سلسلہ مضمون کے تیسرے نمبر میں بہ ضمن "مقصد و حید امت مرحومہ" اس جماعت کے مقاصد و خصایص پر تفصیل سے بحث کی ہے[۴] اسی مضمون کی چوتھی قسط میں مولانا لکھتے ہیں:

"تمہارے پاس آج ایک ایسی مشتعل چنگاری موجود ہے کہ قرینے سے ہوا دو تو اس سے ہزاروں آتش کدے روشن کر سکتے ہو۔ تم آج مسلمانوں کے اعمال میں تبدیلی کر سکتے

---

[۱] البصائر (مراسلات) الہلال، ۱۷ دسمبر ۱۹۱۳ء ص ۱۳ [۲] ایضاً ص ۱۳، ۱۴۔

[۳] الدار والدوار یعنی جماعت حزب اللہ کے اغراض و مقاصد (۱)، ۲۵ جون ۱۹۱۳ء (۲)، ۲ جولائی (۳)، ۹ جولائی (۴)، ۳۰ جولائی (۵)، ۲۴ ستمبر ۱۹۱۳ء [۴] الہلال ۹ جولائی ۱۹۱۳ء ص ۶، ۷۔

ہو۔ ان کے برگشتہ سروں کو خدا کے آگے جھکا سکتے ہو، ان کا گم گشتہ اخلاق، ان کا کھویا ہوا علم اور ان کی مفقود رُوحِ حیاتِ اسلامی کو پھر لا سکتے ہو۔"

آگے چل کر لکھتے ہیں :

"پس آج بھی ہم کو اپنے ہر عمل میں صرف تجدیدِ احکامِ شریعت اور احیائے سنت سلف صالح کی ضرورت ہے۔۔۔۔۔ ہمارے پاس قرآن حکیم اپنی ہیئت و حقیقتِ اولی میں موجود ہے۔ جب کہ اس کی آیتیں بطحا رو یثرب کے ریگستانوں میں اسرار الٰہی سے پردے اٹھا رہی تھیں اور دنیا کو انسانیتِ اعلیٰ کے اصولوں کا سبق دے رہی تھیں۔ پھر کیا ہے کہ ہم نئے مقصدوں کے متلاشی ہوں؟ اور کیوں نئے اصولوں کی دعوت کی طرف ہمیں بلایا جائے؟ نئے ولولوں اور نئے تماشوں کا بھی ہم نے تجربہ کر لیا۔ اب ہم اکتا گئے ہیں اور، اور زیادہ تجربے کی ہم میں سکت نہیں، ہمیں چھوڑ دو تاکہ اپنی قدیمی وحشت کی ایک ادنیٰ ادا پر، تمہاری نئی دل فریبیوں کو قربان کر ڈالیں :

من و بیدل حریفِ سعیِ بیجا نیستم زاہد
تو و قطع منارِ لہا، من و یک لغزشِ پائے [1]

اور جب حزب اللہ کے مختلف مدارج اور جماعتوں کا قیام عمل میں آیا تو ان کا پہلا درجہ سیاحت و تعلیم تھا، اور پہلی جماعت جو اس مقصد کے لیے نکلی وہ "السائحون العابدون" کی جماعت تھی۔ اس کے مقصد اور طریق کار کے بارے میں مولانا لکھتے ہیں :

"حزب اللہ کے مختلف مدارج اور جماعتوں میں سے ایک جماعت "السائحون العابدون" کی ہے جن کا کام یہ ہے کہ تبلیغ و ہدایت اور نشر و اشاعتِ تعلیم قرآن و سنت کے لیے ہمیشہ سفر و گردش میں رہیں اور جس جگہ زیادہ ضرورت دیکھیں وہاں ایک روز سے لے کر سالہا سال تک کے لیے اس طرح مقیم ہو جائیں کہ

نشستہ ایم کہ از ما غبار بر خیزد" [2]

---

[1] الدار و الدوار، م، الہلال، ۳۰ جولائی ۱۹۱۳ء، ص ۷، ۹ [2] اعلان۔ جماعت حزب اللہ، الہلال، ۸ جولائی ۱۹۱۴ء ص ۴ ۔

ان کے طریقِ درس کے بارے میں لکھتے ہیں :

"ان کا طریقِ درسِ قرآن و سنت و عمومِ تعلیم و تبلیغ انہی اصولوں کے ماتحت ہوگا جو دعوتِ الہلال کے اصل الاصول ہیں"۔[1]

اس کے بعد جب مولانا نے دار الارشاد جو حزب اللہ کے دار الجماعۃ کا ایک شعبہ تھا، قائم کیا تو اسی لیے کہ تعلیم کتاب و حکمت اور تربیت اصحاب استعداد کا کام کسی مرکز اور تعلیم و تربیب گاہ کے قیام کے بغیر انجام نہیں پاسکتا تھا[2]

مدرسہ دار الارشاد :

الہلال نے دعوت الی القرآن کی جو صدائے حق بلند کی تھی اور اس دعوت کے شجرِ طیبہ نے جو برگ و بار پیدا کیے تھے، وہی سب کچھ مقصود نہ تھا، درحقیقت، یہ دعوت کی پہلی منزل تھی۔ یہ زمین کا تیار کرنا تھا اور جب کہ یہ عملِ حق ظہور میں آچکا تھا تو ضروری تھا کہ منصوبے کے دوسرے مرحلے یا سفر کی دوسری منزل کا آغاز کر دیا جائے۔ مدرسہ دار الارشاد کا قیام اسی دوسری منزل کا ظہور اور دعوتِ حق کے دوسرے مرحلے کا آغاز تھا۔ اس نئی منزل کے ظہور اور دعوت کے دوسرے مرحلے کے آغاز کے بارے میں مولانا فرماتے ہیں :

"دار الارشاد" کے قیام کا مقصد یہی ہے کہ دعوتِ الی القرآن کی اس دوسری منزل کا سروسامان ہو اور تھوڑے وقت اور بہت زیادہ صرفِ علم و فکر سے ایک ایسی جماعت پیدا کی جائے جو قرآن حکیم کی دعوت و تبلیغ کی خدمت اور اصلاح و ارشادِ امت کا فرض انجام دے سکے۔۔۔"[3]

اس سلسلے میں مزید لکھتے ہیں :

"چار سال پیشتر کا واقعہ ہے کہ مشیت الٰہی نے اس عاجز کی رہنمائی کی اور الہلال نے قرآنِ حکیم کی تبلیغ و دعوت کی صدا از سرِ نو بلند کی لیکن اس عرصے میں جو کچھ ہوا وہ ایک دعوتِ عام تھی جس کے ذریعے فہم و بصیرتِ قرآن کی نئی راہیں عوام و خواص نے اپنے

---

[1] اعلان۔ جماعت حزب اللہ، الہلال ۸ رجولائی ۱۹۱۴ء ص ۵ [2] حزب اللہ۔ دار الجماعۃ کی تاسیس، الہلال، ۲۹ رجولائی ۱۹۱۴ء ص ۸ [3] دار الارشاد، البلاغ ۱۲ رنومبر ۱۹۱۵ء ص ۱۶۔

سامنے دیکھیں اور قرآن حکیم کے عشق و شیفتگی کا ایک نیا ولولہ میں پیدا ہو گیا۔ تاہم اس دعوت کی دوسری منزل ابھی باقی ہے اور وہی فی الحقیقت اہم ترمقام سعی و تعب ہے۔ یعنی قوم میں بکثرت ایسے افراد پیدا کیے جائیں جو انہی راہوں پر چل کر قرآن حکیم کے علوم و معارف کو بہ تکمیل حاصل کریں اور ان کے ذریعے قوم میں ارشاد و ہدایت اور احیائے دعوت و ذکر کا عملی سلسلہ بالعموم شروع ہو سکے"۔[1]

حزب اللہ کے درجات و مراتب، اس کے مدرسہ اور مرکز تعلیم و تربیت کے قیام، اس میں طلبہ کے شرائط داخلہ، نصاب، طریق تعلیم، مدت تعلیم، طلبہ کے قیام و رہائش کے انتظامات کا ایک پورا نظام اور نقشہ کار مولانا کے سامنے تھا، جسے انہوں نے مختلف دفعات میں مرتب کر کے چھاپ دیا تھا۔ مدرسہ دارالارشاد میں داخلے کے اصول و شرائط یہ تھے :

"دارالارشاد میں دو جماعتیں علوم عربیہ اور انگریزی مدارس کے فارغ التحصیل طلباء کی قائم کی گئی ہیں، تاکہ انہیں قرآن حکیم کا درس دے کر ارشاد و ہدایت امت کے لیے تیار کیا جائے۔ پس یہ ایک طرح کا درجہ تکمیل یا علوم القرآن کا ایم۔ اے کلاس ہے۔"[2]

اصول و قواعد مدرسہ کی دفعہ ۸ تا ۱۱ طریق تعلیم، مدت تعلیم اور قیام طلبہ کے انتظامات سے متعلق ہیں، جن کا خلاصہ یہ ہے :

"۸۔ مرکز تعلیم صرف قرآن حکیم ہے۔ آیات بینات، تبیانا لکل شیٔ، ہدی و رحمۃ لقوم یذکرون۔ لیکن اس مرکز کے دائرے میں وہ تمام چیزیں آجائیں گی جو فہم و تبلیغ قرآن کے لیے ضروری ہیں اور جو چیزیں ضروری نہیں ہیں، ظاہر ہے کہ انہیں اس قوم سے کوئی واسطہ نہ ہونا چاہیے جو صرف قرآن کے علم و عمل کے لیے دنیا میں آتی ہے۔

۹۔ گو اصل تعلیم صرف قرآن حکیم ہے، لیکن یہ بمنزلہ نقطہ کے ہے اور اس کا دائرہ وسیع ہے۔

۱۰۔ دارالارشاد کی بڑی سے بڑی مدت تعلیم ایک سال ہے ۔ ۔ ۔ ۔

۱۱۔ جو طلباء منتخب ہوئے ہیں، سر دست ان کے کھانے پینے اور قیام کا بار مدرسہ اپنے سر لیتا ہے۔

---

[1] ایضاً، ص ۱۶ [2] ایضاً، ص، ۱۶۔

ایک پختہ دو منزلہ ہوادار مکان میں جو شہر کے یوروپین کوارٹر میں واقع ہے، وہ ٹھہرائے جاتے ہیں[1]

چنانچہ اس منصوبے کے سلسلے میں کلکتہ کے مشرقی جانب میونسپلٹی کے حدود سے باہر ایک قطعۂ زمین حاصل کر لیا تھا جس میں ایک مسجد کی تعمیر پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی تھی۔ یکم رمضان ۱۳۳۲ھ (جولائی ۱۹۱۴ء) کو مدرسہ کے "دارالجماعۃ" (لیکچر روم) کا سنگِ بنیاد بھی رکھ دیا گیا تھا اور کوشش کی گئی تھی کہ دارالجماعۃ کی تعمیر جلد مکمل ہو جائے تاکہ تعلیم و تدریس اور تربیت اصحابِ استعداد و طالبانِ حق کا کام شروع کر دیا جائے[2] لیکن جب چند در چند موانع کے باعث یہ ممکن نہ ہوا تو کرایہ کی ایک عمارت میں درس و تعلیمِ قرآن کا آغاز کر دیا گیا۔ البلاغ کے پہلے نمبر ہی میں مولانا تحریر فرماتے ہیں:

"گزشتہ سال رمضان میں دارالارشاد کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ ارادہ تھا کہ اسی سال سے تعلیم وارشاد کا سلسلہ بھی شروع کر دیا جائے لیکن مشیتِ الٰہی مساعد نہ ہوئی۔۔۔ موجودہ حالت یہ ہے کہ مدرسہ کا ہال تیار ہو چکا ہے۔ صرف جزئی دبیرونی تکمیل باقی ہے، لیکن جب تک اس کے ساتھ ایک دوسری عمارت طلباء کے قیام کے لیے بھی تیار نہ ہو جائے، اس وقت تک وہاں کام شروع نہیں ہو سکتا۔ عمارت کا مقام شہر سے باہر ہے اور یہ ممکن نہیں کہ شہر میں قیام کر کے اس سے کام لیا جائے۔ طلباء کے کمروں کی تیاری کے لیے اقلاً دس پندرہ ہزار روپے اور ہونا چاہییں۔۔۔۔ کمروں کی تیاری کا انتظار میں کر سکتا ہوں لیکن نہ تو میری زندگی کر سکتی ہے، جس کا قیام نامعلوم ہے اور نہ زمانہ کر سکتا ہے، جس کی رفتار ہمارے ارادوں اور امیدوں کی پابند نہیں۔ پس متوکلاً علی اللہ اس عاجز نے پچھلے دنوں فیصلہ کر لیا کہ سر دست ایک کرایہ کے مکان ہی میں سلسلۂ تدریس وارشاد شروع کر دیا جائے۔۔۔"[3]

مولانا نے سلسلۂ تدریس وارشاد کے آغاز کا صرف عزم ہی نہیں فرمایا تھا بلکہ آغاز کر بھی دیا تھا، البلاغ کا پہلا شمارہ اس ضروری اطلاع کے ساتھ نمودار ہوا تھا۔

"دارالارشاد کا سلسلہ جاری ہو چکا ہے اور ابھی صرف روزانہ درسِ قرآن حکیم ہی کا

---

[1] دارالارشاد، البلاغ ۱۲ر نومبر ۱۹۱۵ء ص ۱۷ [2] حزب اللہ۔ دارالجماعۃ کی تاسیس، الہلال، ۲۹ر جولائی ۱۹۱۴ء ص ۸ [3] دارالارشاد، البلاغ، ۱۲ر نومبر ۱۹۱۵ء ص ۱۵۔

سلسلہ شروع ہوا ہے...... دوسرا اہم سلسلہ تصنیف و تالیف کا ہے۔ یہ پہلے بھی تھا لیکن قرآن حکیم کے ترجمہ و تفسیر کے دو مختلف کام اب ایک ہی وقت میں شروع ہو گئے ہیں اور بلا استثنا ہر روز تھوڑا سا وقت ان کے لیے بھی نکالنا پڑتا ہے۔ علی الخصوص ترجمۃ القرآن کے لیے کہ جہاں تک جلد ہو سکے، اسے مکمل کر دیا جائے کیونکہ ترجمہ کے ساتھ وہ چھپتا بھی جاتا ہے۔"[1]

افسوس کہ مارچ ۱۹۱۶ء میں مولانا کے کلکتہ سے اخراج کی وجہ سے یہ مدرسہ بند ہو گیا لیکن نہ صرف مولانا ابوالکلام آزاد کے ذوقِ تعلیم کتاب و سنت کا نقش تاریخِ دعوتِ قرآن میں ہمیشہ کے لیے ثبت ہو گیا، بلکہ تحریک استقلال وطن کی تاریخ میں بھی اس کا نام ہمیشہ کے لیے لکھ دیا گیا۔ الہلال کی دعوت دینی و سیاسی سے برٹش حکومت پہلے ہی متشوش تھی۔ مدرسہ دارالارشاد میں نوجوان طالبانِ حق کا اجتماع حکومت کی نظروں میں اور زیادہ کھٹکنے لگا۔ اس وقت تو اس کا پتہ نہیں چل سکا لیکن سال ڈیڑھ سال کے بعد ریشمی رومال تحریک کے اسرار کا افشا ہوا تو معلوم ہوا کہ مولانا کے فردِ جرم میں مدرسہ دارالارشاد کا قیام اور اس میں طالبانِ حق کا اجتماع بھی تھا۔ ریشمی رومال سازش کے مقدمے سے مدرسہ کے مقصدِ قیام اور شرائطِ داخلہ کے علاوہ چند طالبانِ حق کے نام بھی معلوم ہو جاتے ہیں جو ۱۵-۱۹۱۴ء میں مولانا کے زیرِ تعلیم دارالارشاد تھے۔ چند معلومات یہ ہیں:

"مدرسہ دارالارشاد مولانا ابوالکلام آزاد نے ۱۹۱۵ء میں کلکتہ میں قائم کیا۔ دیکھنے میں یہ ایک تعلیمی ادارہ ہے جو قرآن و حدیث کی ہدایات کے عین مطابق چلایا جاتا ہے لیکن شرائطِ داخلہ کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وقوف علم کے ساتھ اتحادِ اسلامی کا فروغ بھی اس کالج کا مقصد ہے...... کالج میں داخلہ تمام میٹرک پاس، انڈر گریجویٹ اور گریجویٹ مسلمانوں کے لیے کھلا ہے۔ تمام طلبہ پر چھ ماہ کی ٹریننگ کا کورس پورا کرنے کی پابندی ہے۔ اس کے بعد وہ آزاد ہیں چاہے دارالارشاد کے مقاصد کے لیے کام کریں یا کوئی پیشہ خود اختیار کر لیں۔"[2]

---

[1] اطلاع ضروری، البلاغ ۱۲ر نومبر ۱۹۱۵ء، سرورق ص ۲۔

[2] محمد میاں، مولانا سید (مرتب)، تحریک شیخ الہند، دہلی، الجمعیۃ بک ڈپو، ۱۹۷۵ء، ص ۱۸-۳۱۷۔

ترجمان القرآن :

مدرسہ دارالارشاد کے آغازِ کار ہی سے مولانا کو الہلال و البلاغ کے دعوتی و تعلیمی مقالات کی اشاعت کے ساتھ قرآن حکیم کے مستقل ترجمہ و تفسیر کی ضرورت کا احساس ہو گیا تھا اور انہوں نے اس کے لیے سر و سامان کا آغاز بھی کر دیا تھا۔ اس کے لیے سب سے پہلے ہمیں دسمبر ۱۹۱۳ء کے الہلال میں بسلسلۂ ذکر البصائر اشارہ ملتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں :

"بغیر تعین وقت کے کہتا ہوں کہ جلد سے جلد البصائر کو جس کا اعلان ہو چکا ہے، اور وہ بھی جس کا اعلان نہیں ہوا ہے، پیش کش ارباب ذوق و بصیرت کروں گا۔"[۱]

"وہ بھی جس کا اعلان نہیں ہوا" سے اشارہ یقیناً "ترجمہ قرآن" کی طرف ہے، قرآن حکیم کی عام تعلیم و اشاعت کے لیے جس کی ضرورت کا احساس مولانا کے قلب سلیم میں جاگزیں ہو چکا ہے اور ممکن ہے یہی احساس البصائر کی اشاعت میں التواء کا باعث ہوا ہو کہ دارالارشاد کا کام بغیر ایک رسالہ کے چل سکتا تھا لیکن ترجمۂ قرآن، تفسیر اور مقدمۂ تفسیر کی ضرورت اس کے لیے ناگزیر تھی چنانچہ الہلال کے یکسالہ تعطل کے بعد جب البلاغ کے ذریعہ دعوت الی القرآن کا احیاء ہوا تو اس کا پہلا شمارہ ہی ترجمان القرآن اور تفسیر کے ایمان پرور اور مسرت انگیز اعلان و اشتہار کے ساتھ نمودار ہوا تھا۔ ترجمان القرآن کا اعلان ان الفاظ میں کیا گیا تھا :

"ہندوستان کی گزشتہ قرون اخیرہ میں سب سے پہلے جس مقدس خاندان کو اس خدمت کی توفیق ملی، وہ حضرت شاہ عبدالرحیم رحمۃ اللہ علیہ کا خاندان تھا۔ ان کے فرزند حجۃ الاسلام، امام الاعلام، مجدد العصر، حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ، تھے۔ جنہوں نے سب سے پہلے قرآن حکیم کے ترجمے کی ضرورت الہامِ الٰہی سے محسوس کی اور فارسی میں اپنا عدیم النظیر ترجمہ مرتب کیا۔ ان کے بعد حضرت شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہما کا ظہور ہوا اور اردو زبان میں ترجمۃ القرآن کی بنیاد استوار ہوئی شکر اللہ سعیہم و جعل الجنۃ مثواہم !

اس واقعہ پر ٹھیک ایک صدی گزر چکی ہے۔ لیکن یہ کہنا کسی طرح مبالغہ آمیز نہ سمجھا جائے گا کہ نشر و اشاعتِ قرآن حکیم کی جو بنیاد اس خاندان بزرگ نے رکھی تھی اس کی

---

[۱] البصائر (مراسلات) الہلال ۱۷ دسمبر ۱۹۱۳ء، ص ۱۳، ۱۴۔

تکمیل کا شرف حق تعالیٰ نے ایڈیٹر الہلال کے لیے مخصوص کر دیا تھا جنہوں نے بعض دلائل حق و علم کے اصرار سے اپنے انداز ممتاز و بلاغت و انشاء مخصوص و فہم حقائق و معارف قرآنیہ و ضروریات و احتیاجات وقت کو ملحوظ رکھ کر قرآن حکیم کا یہ اردو ترجمہ نہایت سلیس، عام فہم، معنی خیز، حقیقت فرما عبارت میں مرتب کیا ہے اور بحمد اللہ زیر طبع ہے۔"[۱]

تفسیر کا اشتہار ان الفاظ میں تھا:

"اس تفسیر کے متعلق صرف اس قدر ظاہر کر دینا کافی ہے کہ قرآن حکیم کے حقائق و معارف اور اس کی محیط الکل معلّمانہ دعوت کا موجودہ دور جس قلم کے فیضان سے پیدا ہوا ہے، یہ اسی قلم سے نکلی ہوئی، مفصل اور مکمل تفسیر القرآن ہے۔"[۲]

مولانا نے البلاغ میں ترجمہ و تفسیر کا اعلان کیا تو اس وقت ترجمہ پانچ پاروں تک پہنچ چکا تھا، تفسیر سورۂ آل عمران تک مکمل ہو چکی تھی اور مقدمہ یادداشتوں کی شکل میں قلم بند تھا۔ اس خیال سے کہ تھوڑے وقت کے اندر زیادہ سے زیادہ کام انجام پائے۔ مولانا نے ترجمہ و تفسیر کی تالیف و تصنیف کے ساتھ چھپائی کا سلسلہ بھی شروع کرا دیا تھا۔ مولانا کا خیال تھا کہ اس طرح سال بھر کے اندر ترجمہ مکمل بھی ہو جائے گا اور چھپ بھی جائے گا۔ نیز تفسیر کی بھی کم از کم پہلی جلد شائع ہو جائے گی اس منصوبے کے مطابق کام کی انجام دہی کے لیے مولانا نے ہر سات دن کی مشغولیت کی تقسیم اس طرح کی تھی کہ تین دن البلاغ کی ترتیب کے لیے وقف تھے۔ دو دن ترجمہ کی تالیف کے لیے اور دو دن تفسیر کے کام کے لیے مقرر کر دیے تھے[۳]

مولانا اسی نظام الاوقات کے مطابق دارالارشاد میں طلبہ کی تدریس دارشاد، البلاغ کی ترتیب اور ترجمہ و تفسیر کی تالیف و تصنیف کے اعمال حقہ میں مصروف تھے کہ ۲۸ مارچ ۱۹۱۶ء کو

---

[۱] ترجمان القرآن، البلاغ ۱۲ نومبر ۱۹۱۵ء، سرورق، ص ۱۔ یہ اعلان البلاغ کے پہلے شمارے سے لے کر ۷، ۱۴، ۲۴، ۳۱، مارچ ۱۹۱۶ء کے آخری شمارے تک سرورق صفحہ ۱ پر چھپتا رہا [۲] البیان فی مقاصد القرآن، البلاغ، ۱۲ نومبر ۱۹۱۵ء، سرورق، ص ۴۔ یہ اعلان بھی البلاغ کے پہلے شمارے سے لے کر آخری شمارے تک سرورق صفحہ ۴ پر مسلسل چھپتا رہا، [۳] ترجمان القرآن، دہلی، دفتر ترجمان القرآن، ۱۳۵۰ھ (اشاعت اول جلد اول)، ص ۵۹، ۶۰۔

گورنمنٹ بنگال کا حکم زیر دفعہ ۳ ڈیفنس ایکٹ پہنچا کہ مولانا چار دن کے اندر کلکتہ کا قیام ترک کر دیں اور حدودِ بنگال سے باہر چلے جائیں[۱] مولانا جس وقت کلکتہ سے روانہ ہوئے تو تفسیر کے چھ فارم چھپ چکے تھے اور ترجمہ کی کتابت شروع ہو گئی تھی[۲] مقدمہ تفسیر بھی چھپ رہا تھا۔ اس وقت تک اس کے کم از کم بارہ ابواب نہ صرف لکھے جا چکے تھے بلکہ چھپ بھی گئے تھے۔ اس لیے کہ مولانا کے انتقال کے بعد ان کے کاغذات سے مقدمہ کے چھپے ہوئے جو ناقص اجزاء دستیاب ہوئے ہیں وہ بارہویں باب کے کچھ اوراق ہیں جو ترجمان القرآن کے ساہیتہ اکاڈمی ایڈیشن کی جلد اول کے ۴۹ صفحات بنے ہیں ان بارہ ابواب کے صفحات کو کتنا ہی کم تصور کر لیا جائے تب بھی ان کی تعداد سیکڑوں تک جا پہنچتی ہے۔ مولانا کا ارادہ تھا کہ اس کے ابتدائی اجزاء بھی تفسیر البیان فی مقاصد القرآن کی پہلی جلد کے ساتھ شایع ہو جائیں اور پھر ہر جلد کے ساتھ شایع ہوتے رہیں گے[۳] بعض نکتہ چیں حضرات کا خیال تھا کہ مقدمہ تفسیر مولانا کا خیال تھا جو وجود پذیر نہیں ہو سکا، لیکن اب اس کے بارہویں باب کے کچھ مطبوعہ اوراق کی دستیابی نے اس بدگمانی کو دور کر دیا ہے۔

کلکتہ سے نکلنے کے بعد مولانا نے یہ کوشش کی کہ انکی عدم موجودگی میں ترجمہ و تفسیر کی طباعت و اشاعت کا کام جاری رہے۔ چنانچہ جون ۱۹۱۶ء میں پریس کے دوبارہ اجراء کا انتظام کر دیا گیا، اور رانچی کے گوشۂ خلوت میں مسودات کی ترتیب میں مشغول ہو گئے۔ لیکن حکومت کو مولانا کے پیش نظر مقاصد کی دعوت و اشاعت کا یہ کام کسی صورت میں گوارا نہ ہوا اور اس نے ۸ر جولائی ۱۹۱۶ء کو مولانا کی نظر بندی کے احکام جاری کر دیے جن کے تحت مولانا بیرونی دنیا سے اس قسم کا کوئی علاقہ نہ رکھ سکتے تھے۔ اس طرح اس امید کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ اب مولانا کے اختیار میں صرف ایک ہی کام رہ گیا تھا، یعنی تصنیف و تسوید کا مشغلہ۔ مولانا لکھتے ہیں:

"نظر بندی کی انیس دفعات میں سے کوئی دفعہ بھی مجھے اس سے نہیں روکتی تھی۔ میں نے اس پر قناعت کی۔ اتنا ہی نہیں، بلکہ میں نے خیال کیا، اگر زندگی کی تمام آزادیوں سے محروم

---

[۱] اداریہ البلاغ، ۱۷، ۲۴، ۳۱ر مارچ ۱۹۱۶ء (آخری شمارہ) ص ۱ [۲] دیباچہ ترجمان القرآن ۱۹۳۱ء جلد اول ص ۶۰ [۳] اجمل خاں محمد، مقدمۃ البیان کے بارھویں باب کا ایک حصہ (ملحقات)، ترجمان القرآن دہلی، ساہیتہ اکاڈمی ۱۹۶۴ء جلد اول ص ۵۵۳۔

ہونے پر بھی لکھنے پڑھنے کی آزادی سے محروم نہیں ہوں اور اس کے نتائج محفوظ ہیں تو زندگی کی راحتوں میں سے کوئی راحت بھی مجھ سے الگ نہیں ہوئی۔ میں اس عالم میں پوری زندگی بسر کر دے سکتا ہوں، لیکن ابھی اس صورتِ حال پر تین مہینے بھی نہیں گزرے تھے کہ معلوم ہو گیا، اس گوشے میں بھی مجھے محرومی سے دو چار ہونا تھا۔'' ؎۵

مولانا نے مسودات کی ضبطی اور ان سے محرومی کی نہایت الم ناک داستان ترجمان القرآن کے دیباچے میں بیان کر دی ہے۔ اس کا تفصیل مطالعہ وہیں کرنا چاہیے۔ یہاں ربطِ مطالب کے لیے یہ بیان کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے:

۱۔ جس وقت جلا وطنی کا معاملہ پیش آیا، ترجمہ کا مسودہ آٹھ پاروں تک اور تفسیر کا مسودہ سورۂ نساء تک پہنچ چکا تھا۔

۲۔ نظر بندی کے احکام جس وقت نافذ کیے گئے تو مولانا کے مکان کی تلاشی میں ترجمہ و تفسیر کے مسوّدات افسرانِ تفتیش کے قبضے میں چلے گئے تھے لیکن جب ان میں کوئی خاص بات انہیں نظر نہ آئی تو دو ہفتے کے بعد مولانا کو واپس مل گئے۔

۳۔ مرکزی حکومت صوبائی حکومت کی اس کارروائی سے مطمئن نہ ہوئی تو حکومتِ ہند کے محکمۂ تفتیش کا افسرِ اعلیٰ بذاتِ خود پہلے کلکتہ پہنچا اور پھر رانچی جا کر ازسرِ نو مولانا کے مکان کی تلاشی لی اور وہ تمام کاغذات جو پہلی تلاشی کے بعد واپس کر دیے گئے تھے دوبارہ اپنے قبضے میں کر لیے۔

۴۔ مولانا نے اس امید پر کہ ترجمہ و تفسیر کا مسوّدہ واپس مل جائے گا۔ نویں پارے سے ترجمہ کا کام شروع کر دیا اور ۱۹۱۸ء کے اواخر میں اس سے فارغ ہو گئے۔

۵۔ اس زمانے میں مولانا نے کاغذات کی واپسی کی کوشش کی لیکن جب اس میں ناکامی ہوئی تو چند ماہ کی محنت کے بعد مولانا نے ابتدائی آٹھ پاروں کا ترجمہ بھی مکمل کر لیا اور پھر اردو ٹائپ رائٹر منگوا کر اسے ٹائپ کرانا بھی شروع کر دیا چنانچہ ۲۷ دسمبر ۱۹۱۹ء کو حکومت نے مولانا کو رہا کیا تو نصف سے زیادہ ترجمہ ٹائپ ہو چکا تھا۔

؎۵ ترجمان القرآن (اشاعت اول) جلد اوّل ص ۶۰۔

۶۔ ۱۹۲۰ء،۲۱ء تحریک خلافت اور تحریک لاتعاون کی سرگرمیوں کے سال تھے اور چونکہ یہ حرکت اور سرگرمی الہلال کی دعوتِ سیاسی کی صدائے بازگشت تھی۔ اس لیے مولانا ان سرگرمیوں سے صرفِ نظر نہ کر سکتے تھے۔ اس کے باوجود مولانا نے ترجمان القرآن کا کام جاری رکھا۔ نومبر ۱۹۲۱ء تک متن کی کتابت مکمل ہو گئی تھی ترجمہ کی کتابت شروع ہوئی تھی۔ ۱۰ر دسمبر ۱۹۲۱ء کو تحریک کے دوسرے رہنماؤں کے ساتھ مولانا کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔ لیکن مولانا مطمئن تھے کہ اس مرتبہ ان کی گرفتاری سے پریس کے انتظامات میں خلل نہیں پڑے گا۔ کیونکہ کتاب مکمل موجود تھی اور اس کا پورا انتظام کر دیا تھا کہ مولانا کی عدم موجودگی میں بھی کام بدستور ہوتا رہے۔

۷۔ مولانا کی گرفتاری کے بعد حکومت نے محسوس کیا کہ مقدمہ چلانے اور سخت سزا کا مستوجب ٹھہرانے کے لیے کافی مواد موجود نہیں ہے۔ اس لیے مولانا کے مطبع اور مکان کی تلاشی لی گئی اور دیگر کاغذات کے ساتھ ترجمان القرآن کی تمام لکھی ہوئی کاپیاں اور مسودات بھی توڑ مروڑ کر کاغذات میں ملا دیے اور "متفرق کاغذات" کی رسید دے کر افسرانِ تفتیش اپنے ساتھ لے گئے۔

۸۔ پندرہ ماہ کی رہائی کے بعد مولانا نے کاغذات کی واپسی کے لیے کوشش کی لیکن جو کچھ ہاتھ آیا، وہ محض اوراقِ پریشان کا ایک ڈھیر تھا اور نصف سے زیادہ اوراق یا تو ضائع ہو چکے تھے یا اطراف سے پھٹے ہوئے اور پارہ پارہ تھے۔

۹۔ اب ترجمان القرآن اور تفسیر کی ہستی اس کے سوا ممکن نہ تھی کہ ازسرِ نو محنت کی جائے لیکن اس حادثہ کے بعد طبیعت کچھ اس طرح افسردہ ہو گئی کہ ہر چند کوشش کی مگر ساتھ نہ دے سکی۔ اس طرح کئی سال گزر گئے لیکن مولانا اپنے آپ کو اس کام کے لیے آمادہ نہ کر سکے۔ مولانا لکھتے ہیں:

> "بارہا ایسا ہوا کہ ترجمہ و تفسیر کے بچے کھچے اوراق نکالے، لیکن جوں ہی برباد شدہ کاغذات پر نظر پڑی، طبیعت کا انقباض تازہ ہو گیا اور دو چار صفحے لکھ کر چھوڑ دینا پڑا لیکن ایک ایسے کام کی طرف سے جس کی نسبت میرا یقین تھا کہ مسلمانوں کے لیے وقت کا سب سے زیادہ ضروری کام ہے، ممکن نہ تھا کہ زیادہ عرصہ تک طبیعت غافل رہتی، جس قدر وقت گزرتا جاتا تھا اس کام کی ضرورت کا احساس میرے لیے ناقابل برداشت ہوتا جاتا تھا۔ میں محسوس کرتا تھا کہ اگر یہ کام مجھ سے انجام نہ پایا تو شاید عرصہ تک اس کی

انجام دہی کا کوئی سامان نہ ہو۔ ۱۹۲۷ء قریب الاختتام تھا، کہ اچانک مدتوں کی رکی ہوئی طبیعت میں جنبش ہوئی اور رشتہ کار کی جو گرہ ذہن و دماغ کی پیہم کوششیں نہ کھول سکی تھیں، دل کی جوشش سے بے اختیار خود بخود کھل گئی۔ کام شروع کیا تو ابتدا میں چند دنوں تک طبیعت رکی رکی رہی، لیکن جونہی ذوق و فکر کے دو چار جام گردش میں آئے، طبیعت کی ساری رکاوٹیں دور ہوگئیں اور پھر تو ایسا معلوم ہونے لگا، گویا اس شورش کدۂ مستی میں کبھی افسردگی و خمار آلودگی کا گزر ہی نہیں ہوا تھا۔"

۱۰۔ بہر حال کام شروع ہوگیا اور اس خیال سے کہ سورۂ فاتحہ کی تفسیر ترجمہ کے لیے بھی ضروری ہے۔ مولانا سب سے پہلے اسی کی طرف متوجہ ہوئے پھر ترجمہ کی ترتیب شروع کی۔ حالات اب بھی موافق نہ تھے تاہم کام کا سلسلہ کم و بیش جاری رہا اور ۲۰ جولائی ۱۹۳۰ء کو آخری سورت کے ترجمہ و ترتیب سے فارغ ہو گئے۔[1]

مولانا مرحوم کے پیش نظر قرآن کے درس و مطالعہ کی تین مختلف ضرورتیں تھیں اور مولانا نے انہیں تین مختلف کتابوں میں منقسم کر دیا تھا۔

۱۔ مقدمہ تفسیر البصائر۔ قرآن کے مقاصد و مطالب پر اصول و مباحث کا مجموعہ جس میں کوشش کی گئی ہے کہ مطالب قرآنی کے جوامع و کلیات مدوّن ہو جائیں۔

۲۔ تفسیر البیان فی مقاصد القرآن۔ عام اور تفصیلی نظر و مطالعہ کے لیے تھی۔

۳۔ ترجمان القرآن۔ قرآن کی عالمگیر تعلیم و اشاعت کے لیے۔[2]

البصائر :

مقدمہ تفسیر کے بارے میں گزر چکا ہے کہ اس کے کم از کم بارہ ابواب نہ صرف لکھے گئے تھے بلکہ چھپ بھی گئے تھے، جس کے کچھ صفحات دستیاب ہو گئے ہیں۔ ان بارہ ابواب کے صفحات کتنے ہی کم تصور کر لیے جائیں، ان کی تعداد سیکڑوں میں شمار کی جا سکتی ہے۔ رانچی کی نظر بندی کے زمانے میں ترجمہ و تفسیر کی تالیف و تصنیف کی مصروفیت کے ساتھ کئی اور قرآنی تالیفات اور مقدمہ کی تالیف

---

[1] ترجمان القرآن (اشاعت اول) جلد اول، ص ۶۰-۶۴ [2] ترجمان القرآن، محولہ بالا، جلد اول، ص ۷۲۔

کا شغل بھی جاری تھا۔ تذکرہ میں متعدد مقامات پر اس کا ذکر آیا ہے۔ ایک مقام پر اس کے اکیسویں باب کا حوالہ آیا ہے۔ مولانا لکھتے ہیں:

"شرح حقیقت تحریفِ شریعت علی الخصوص فتنتین عظیمتین یونانیہ و عجمیہ کے لیے مقدمہ تفسیر باب بست و یکم اور تفسیر فاتحۃ الکتاب کو دیکھنا چاہیئے"[۱]

مقدمہ کا نام "البصائر" تھا[۲]

ترجمان القرآن جلد دوم میں بھی متعدد مقامات پر مقدمہ کے مباحث و مطالب کی طرف اشارات آئے ہیں[۳] اور ۱۹۳۰ء میں جبکہ ترجمان القرآن کی تالیف سے فارغ ہو چکے تھے۔ مقدمہ کے قدیم مسودات کی تہذیب و ترتیب میں مشغول تھے[۴] تذکرہ اور ترجمان کے اگر ان تمام حوالہ جات اور مقدمہ کے بارہویں باب کے دستیاب شدہ صفحات کو سامنے رکھا جائے تو مقدمہ کے ابواب اور ان کے مضامین و مباحث کی ایک جامع فہرست تیار کر لی جا سکتی ہے اور اندازہ کر لیا سکتا ہے کہ اس کے مطالب کی نوعیت مضامین کی اہمیت، مباحث کی جامعیت، مسائل کی تحقیق، دعوت کی دل نشینی، زبان کی لطافت اور اسلوب نگارش کی دلربائیوں کا کیا عالم ہوگا۔

تفسیر البیان کی ترتیب بعد میں مولانا نے بدل دی تھی اور ترجمان القرآن کی دوسری جلد میں متعدد سورتوں کے بعد ان کے اہم مقامات و مباحث پر جو تفصیلی مقالات نظر آتے ہیں درحقیقت یہ البیان ہی کے اجزاء تفسیر ہیں۔

ترجمان القرآن کے بعض خصائص:

سلسلۂ درس و مطالعۂ قرآن کی سب سے اہم چیز "ترجمان القرآن" تھا۔ آج بھی ہمارے سامنے ہے اور ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ترتیب اور بعض خصائص کے بارے میں چند ضروری اشارات کر دیئے جائیں، اس کے لیے ہمیں کسی تحقیق کی زحمت کی ضرورت نہیں۔ حضرت مولانا ہی کے الفاظ کافی ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں:

---

[۱] تذکرہ، کلکتہ، البلاغ پریس ۱۹۱۹ء ص ۱۹۳ (حاشیہ)۔ [۲] ایضاً، ص ۲۷۰ [۳] ترجمان القرآن، لاہور، مکتبہ مصطفائی، ۱۹۳۶ء، جلد دوم ص ۱۸۰، ۲۱۵، ۳۳۵، ۴۸۸، ۴۹۵ وغیرہ۔

[۴] ترجمان القرآن، جلد اوّل، ص ۶۵۔

"اس کی ترتیب سے مقصود یہ ہے کہ مطالبِ قرآن کے فہم و تدبر کے لیے ایک ایسی کتاب تیار ہو جائے جس میں کتبِ تفسیر کی سی تفصیلات تو نہ ہوں لیکن وہ سب کچھ ہو جو قرآن کو ٹھیک ٹھیک سمجھ لینے کے لیے ضروری ہے۔ اس غرض سے جو اسلوب اختیار کیا گیا ہے امید ہے کہ اہلِ نظر اس کی موزونیت بیک نظر محسوس کر لیں گے۔

پہلے کوشش کی ہے کہ قرآن کا ترجمہ اردو میں اس طرح مرتب ہو جائے کہ اپنی وضاحت میں کسی دوسری چیز کا محتاج نہ رہے۔ اپنی تشریحات خود اپنے ساتھ رکھتا ہو۔ پھر جا بجا نوٹوں کا اضافہ کیا ہے، جو سورت کے مطالب کی رفتار کے ساتھ ساتھ برابر چلے جاتے ہیں اور جہاں کہیں ضرورت دیکھتے ہیں، مزید رہنمائی کے لیے نمودار ہو جاتے ہیں۔ یہ قدم قدم پر مطالب کی تفسیر کرتے ہیں، اجمال کو تفصیل کا رنگ دیتے ہیں، مقاصد و وجوہ سے پردے اٹھاتے ہیں۔ دلائل و شواہد کو روشنی میں لاتے ہیں، احکام و نواہی کو مرتب و منضبط کرتے ہیں اور زیادہ سے زیادہ مختصر لفظوں میں زیادہ سے زیادہ معانی و معارف کا سرمایہ فراہم کرتے جاتے ہیں۔ یہ گویا قاریٔ قرآن کے لیے تفکر و تدبر کی روشنی ہے، جو بحکم نورھم یسعی بین ایدیھم وبایمانھم (۵۷:۱۲) اس کے ساتھ ساتھ چلتی رہتی ہے اور کہیں بھی اس کا ساتھ نہیں چھوڑتی..... یہ حقیقت پیشِ نظر رہے کہ ترجمان القرآن کے نوٹ تشریح و وضاحت کا ایک مزید درجہ ہیں، ورنہ قرآن کا صاف صاف مطلب سمجھ لینے کے لیے متن کا ترجمہ پوری طرح کفایت کرتا ہے

نوٹس کی ترتیب کا معاملہ نفس ترجمہ سے کم مشکل نہ تھا۔ یہ ظاہر ہے کہ ان کے لیے ایک محدود مقدار سے زیادہ جگہ نہیں نکل سکتی تھی اور نوٹ نوٹ نہ رہتے اگر ایک خاص مقدار سے کمیت یا تعداد میں زیادہ ہو جاتے۔ لیکن ساتھ ہی ضروری تھا کہ کوئی ضروری مقام تشنہ نہ رہ جائے اور مطالب و مقاصد قرآنی کی تمام مہمات واضح ہو جائیں۔ بس پوری احتیاط کے ساتھ الیساطرلق بیان اختیار کیا گیا کہ لفظ کم سے کم ہیں لیکن اشارات زیادہ سے زیادہ سمیٹ لیے گئے ہیں جس چیز کی لوگ کمی پائیں گے، وہ صرف مطالب کا پھیلاؤ ہے۔ نفس مطالب میں کوئی کمی محسوس نہ ہوگی۔ ہر لفظ اور

ہر جملہ پر جس قدر غور کیا جائے گا، مطالب و مباحث کے نئے نئے دفتر کھلتے جائیں گے"۔[۵]

دیباچے کے آخر میں مولانا نے پورے سلسلۂ ترجمہ و تفسیر اور دعوت و حقیقت قرآنی کے بارے میں اپنے اعتقاد کا اظہار کیا ہے، مولانا فرماتے ہیں:

"کامل ستائیس برس سے قرآن میرے شب و روز کے فکر و نظر کا موضوع رہا ہے اس کی ایک ایک سورت، ایک ایک مقام، ایک ایک آیت، ایک ایک لفظ پر میں نے وادیاں قطع کی ہیں اور مرحلے پر مرحلے طے کیے ہیں۔ تفسیر و کتب کا جتنا مطبوعہ و غیر مطبوعہ ذخیرہ موجود ہے، میں کہہ سکتا ہوں کہ اس کا بڑا حصہ میری نظر سے گزر چکا ہے اور علوم قرآن کے مباحث و مقالات کا کوئی گوشہ نہیں جس کی طرف سے ذہن نے تغافل اور جستجو نے تساہل کیا ہو۔ علم و نظر کی راہوں میں آج کل قدیم و جدید کی تقسیمیں کی جاتی ہیں، لیکن میرے لیے یہ تقسیمیں بھی کوئی تقسیم نہیں۔ جو کچھ قدیم ہے وہ مجھے ورثے میں ملا اور جو کچھ جدید ہے، اس کے لیے اپنی راہیں آپ نکالی ہیں، میرے لیے وقت کی جدید راہیں بھی ویسی ہی دیکھی بھالی ہیں، جس طرح قدیم راہوں کے چپہ چپہ کا شناسا ہوں۔

رہا ہوں رند بھی مَیں اور پارسا بھی مَیں
مری نظر میں ہیں رندان و پارسا اک ایک

خاندان، تعلیم اور سوسائٹی کے اثرات نے جو کچھ میرے حوالے کیا تھا، میں نے اول دن ہی اس پر قناعت کرنے سے انکار کر دیا اور تقلید کی بندشیں کسی گوشے میں بھی روک نہ ہو سکیں اور تحقیق کی تشنگی نے کسی میدان میں بھی ساتھ نہ چھوڑا:

ہیچ گہ ذوق طلب از جستجو بازم نہ داشت
دانہ می چیدم دراں روزے کہ خرمن داشتم

میرے دل کا کوئی یقین ایسا نہیں ہے، جس میں شک کے سارے کانٹے نہ چبھ چکے ہوں اور میری روح کا کوئی اعتقاد ایسا نہیں ہے جو انکار کی ساری آزمائشوں میں سے

[۵] ترجمان القرآن محولہ بالا، جلد اول، ص ۷۶۔۷۷

نہ گزر چکا ہو۔ میں نے زہر کے گھونٹ بھی ہر جام سے پیے ہیں اور تریاق کے نسخے بھی ہر دار الشفار کے آزمائے ہیں۔ میں جب پیاسا تھا تو میری لب تشنگیاں دوسروں کی طرح نہ تھیں اور جب سیراب ہوا تو میری سیرابی کا سرچشمہ بھی شاہراہِ عام پر نہ تھا۔

راہے کہ خضر داشت، ز سرچشمہ دور بود — لب تشنگی زراہ دگر بردہ ایم ما!

اس تمام عرصے کی جستجو و طلب کے بعد قرآن کو جیسا کچھ اور جتنا کچھ سمجھ چکا ہوں، میں نے ان کتابوں کے صفحوں پر پھیلا دیا ہے:

ترجمان القرآن، البیان، مقدمۂ تفسیر:

سبک زجائے نگیری کہ بس گراں گہر ست
متاعِ من کہ نصیبش مبـاد ارزانی!"

آخر میں مولانا نے اپنے اس یقین کا اظہار کیا ہے:

"میرا یقین ہے کہ مسلمانوں کی زندگی اور سعادت کے لیے سرچشمۂ حیات، حقیقتِ قرآنی کا انبعاث ہے اور میں نے کوشش کی ہے کہ اس کے فہم و بصیرت کا دروازہ ان پر کھل جائے۔ میں ترجمان القرآن شایع کرتے ہوئے محسوس کرتا ہوں کہ اس بارے میں جو کچھ میرا فرض تھا، توفیقِ الٰہی کی دستیاری سے میں نے ادا کر دیا۔ اب اس کے بعد جو کچھ ہے، وہ مسلمانوں کا فرض ہے اور یہ اللہ کے ہاتھ میں ہے کہ انہیں ادائے فرض کی توفیق دے۔

حدیثِ عشق و سرمستی زمن بشنو نہ از واعظ
کہ با جام و سبو ہر شب قرینِ ماہ و پروینم!

ما كان حديثا يفترى ولكن تصديق الذى بين يديه وتفصيل كل شئ وهدى ورحمة لقوم يوقنون" (۱۲: ۱۱۱)[۱]

ترجمان القرآن کے بارے میں یہ تو مولانا کا اعتقاد تھا، علمی دنیا نے اسے کس نظر سے دیکھا اور کس طرح اس کی پذیرائی کی یہ ایک طویل داستان ہے۔ پیشِ نظر مقصد کے لیے بہت سے حوالوں کا نقل

---

[۱] ترجمان القرآن، جلد اوّل، ص ۷۵، ۷۶۔

کر دینا ضروری نہیں۔ البتہ اس عہد کے سب سے بڑے اسلامی محقق کی رائے کے اقتباس کے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا۔ تاکہ معلوم ہو جائے کہ ترجمان القرآن کی علمی حیثیت، تفسیری نوعیت اور دعوتِ قرآن کی تاریخ میں اس کی تعلیمی اہمیت اور افادیت کیا ہے: مولانا سید سلیمان ندویؒ فرماتے ہیں:

"مصنف ترجمان القرآن کی یہ دیدہ وری داد کے قابل ہے کہ انہوں نے وقت کی روح کو پہچانا اور اس فتنۂ فرنگ کے عہد میں اس طرز وروش کی پیروی کی جس کو ابن تیمیہؒ اور ابن قیمؒ نے فتنۂ تاتار میں پسند کیا تھا اور جس طرح انہوں نے اس عہد کے مسلمانوں کی تباہی کا راز فلسفۂ یونان کی دماغی پیروی کو قرار دیا تھا۔ اسی طرح اس عہد کے مسلمانوں کی بربادی کا سبب ترجمان القرآن کے مصنف نے فلسفۂ یونان و فرنگ کی ذہنی غلامی کو قرار دیا اور نسخۂ علاج وہی تجویز کیا کہ کلامِ الٰہی کو رسول کی زبان واصطلاح اور فطرت کی عقل اور فلسفہ سے سمجھنا چاہیے"[۱]

آخر میں ترجمان القرآن کے بارے میں لکھتے ہیں:

"ترجمان القرآن وقت کی ایک اہم چیز ہے، ضرورت ہے کہ اس کو گھر گھر پھیلایا جائے اور نوجوانوں کو اس کے مطالعے کی ترغیب دی جائے اور ہر اسلامی دارالمطالعہ میں اس کا ایک نسخہ منگوا کر رکھا جائے"[۲]

دیگر قرآنی تصنیفات

مولانا ابوالکلام آزادؒ نے ترجمان، البیان، مقدمہ کی صورت میں قرآنِ حکیم کی دعوت کا جو کارنامہ انجام دیا اور جو کچھ آج دنیا کے سامنے ہے، اگر صرف وہی کچھ ہوتا تب بھی ان کے شرف وفضیلت کے لیے کافی تھا لیکن مولانا آزاد کی خدمتِ قرآن اور دعوت وارشادِ تعلیماتِ الٰہی کی داستان ابھی ختم کہاں ہوئی اور ان کے ذوقِ تمسک بالکتاب کی حکایت کے آخری باب تک ابھی ہم کہاں پہنچے، مولانا کے ناصیۂ سعادت میں ابھی اور بھی کئی مولفات جواہرِ قرآنی ہیں جن کے نظارۂ جمال کے بغیر ہم آگے نہیں بڑھ سکتے۔ اس لیے قارئین کرام ہمیں اجازت دیں کہ ان پر بھی ایک نگاہِ ذوق آشنا

---

[۱] ترجمان القرآن (مقالہ، ابوالکلام آزاد) مرتبہ عبداللہ بٹ ۱۹۴۳ء، ص ۸۳ [۲] ایضاً، ص ۸۵

ڈالتے چلیں۔

۱۔ **مراتب ہدایت وشقاوت امم وملل از روئے قرآن** : یہ ایک رسالہ کا موضوع ہے نام نہیں ہے۔ مولانا نے ۱۹۱۲ء میں تحریر فرمایا تھا[۱]۔ یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ مطبع الہلال میں زیر طبع تھا۔ بعد میں اس کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ اگرچہ مراتب ہدایت پر نہایت ایمان افروز بحث تفسیر سورۂ فاتحہ میں آگئی ہے اس کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

۲۔ **تفسیر سورۂ واقعہ** : مولانا نے ۱۹۱۴ء میں سورۂ واقعہ کی تفسیر میں ایک رسالہ لکھا تھا[۲]۔ آج یہ رسالہ تو ہمارے پیش نظر نہیں، لیکن اس کی تیس سے زیادہ آیات کی تفسیر جو اولیاء اللہ و اولیاء الشیطان کے ضمن میں نیز ترجمان القرآن میں انہوں نے مرتب کر دی ہے اس سے بھی اس کی عبرت آموزی، معنی آفرینی اور فکر انگیزی کا اندازہ کر لیا جاسکتا ہے۔

۳۔ **خصائص مسلم** : مسلم زندگی کا کریکٹر، حسب تصریحات قرآن[۳]۔

۴۔ **امثال القرآن**[۴] : امثال قرآنی کی حکمت پذیری اور سبق آموزی۔

۵۔ **تحصیل السعادتین** : شریعت مطہرہ میں تحریف کی حقیقت خصوصاً فتنہ ہائے یونان و عجم کے سلسلے میں مقدمہ تفسیر کے اکیسویں باب میں مولانا نے تفصیل کے ساتھ بحث کی تھی اور پھر اسے ایک مستقل رسالہ کی صورت میں الگ "تحصیل السعادتین" کے نام سے بھی مرتب کر دیا تھا[۵]۔ افسوس کہ آج نہ مقدمہ تفسیر موجود ہے نہ یہ رسالہ۔ البتہ تذکرہ میں تقریباً چھ صفحے کا ایک حاشیہ اسی موضوع پر متن تذکرہ میں، ترجمان القرآن جلد اول کے دیباچے میں نیز مختلف مقالات میں "فتنتین عظیمتین یونانیہ و عجمیہ" پر نہایت فکر انگیز مفصل بحثیں اور مختصر اشارات آگئے ہیں اور جس طرح اس اندازِ فکر نے فہم قرآن کے راستے مسدود کیے، ان کے بارے میں ایمان افروز افادات مرتب ہو گئے ہیں۔ اگر کوشش کی جائے تو ان مطالب پر مشتمل ایک عمدہ رسالہ مرتب کر دیا جاسکتا ہے۔

---

[۱] الہلال، ۱۶ر اکتوبر ۱۹۱۲ء، ص ۶ (حاشیہ) [۲] الہلال، ۲۲ر جولائی ۱۹۱۴ء، ص ۶ (حاشیہ)، ترجمان القرآن محولہ بالا، جلد اول، ص ۳۳-۳۲

[۳] تذکرہ ص ۲۰۲، ذکر آزاد، مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی، کلکتہ، ۱۹۶۰ء، ص ۲۸۴، والہلال، ۲۴ر جون ۱۹۲۷ء ص ۴ [۴] الہلال، ۲۴ر جون ۱۹۲۷ء ص ۴۔ [۵] تذکرہ، ص ۱۹۲ (حاشیہ)۔

۶۔ **اتحاف الخلف بطریقۃ السلف**: یہ رسالہ ۱۹۱۶ء میں مولانا نے رانچی میں تحریر کیا تھا۔ اس کا موضوع "اصحاب تاویل ورائے اور متکلمین واتباع فلاسفہ کی بے حاصلی و نامرادی اور سلف امت و اصحاب تفویض کے مذہب حق و طریق حکمت اور عقلیات صادقہ وفاضلہ کا اثبات ونصرت ہے[1]۔ تذکرہ میں اور ترجمان القرآن جلد اول کے دیباچہ واصل تفسیر میں مختصراً یہ بیان آیا ہے۔

۷۔ **الکلم الطیب**: تذکرہ میں مولانا نے ان دونوں رسائل کا ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ ان میں علوم سماویہ کے خلاف انسان کے شکوک وشبہات کو جن کا قرآن نے ذکر کیا، مرتب کیا ہے، پھر ان کا جواب بھی از روئے قرآن دیا ہے۔ پھر دکھایا ہے کہ جس وقت سے انسانی علوم اور علوم سماویہ کی آویزش کا حال معلوم ہے، اس وقت سے لے کر آج تک کوئی شبہ واعتراض ایسا نہیں کیا گیا ہے جس کا اصولاً جواب قرآن میں نہ دے دیا گیا ہو[2]۔

۸۔ **القول الثابت**: اس کا زمانہ تصنیف بھی رانچی کا عہد اسارت ہے اور اس کا موضوع الکلم الطیب سے ملتا جلتا ہے۔ ذکر آزاد میں مولانا اس رسالے کے موضوع کے تعارف میں لکھتے ہیں کہ اس میں مذہب اور عقل کی باہمی آویزش پر بحث کی ہے اور دکھایا ہے کہ سائنس کی حد "محسوسات" ہے اور مذہب کی ماورائے محسوسات، اس لیے دونوں کا دائرہ نظر وعلم الگ ہے اور دونوں میں اصلاً کوئی نزاع نہیں۔ البتہ نزاع اس وقت ہوتی ہے جب پیروان مذہب کے نام سے جہل و توہمات کا علم اٹھا لیتے ہیں[3]۔

۹۔ **قانون نشو وارتقا اور قرآن**: اس میں دکھایا ہے کہ نشو وارتقا کے قانون کو مغربی فلسفیوں نے انیسویں صدی میں دریافت کیا، جب کہ مسلمان حکماء عہد وسطیٰ ہی میں اس کے دائرۂ ارتقاء کو اس سے کہیں زیادہ وسیع ثابت کر چکے تھے۔ پھر واضح کیا ہے کہ خود قرآن نے اس کو اصل نظام کائنات بتایا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ انسانی اعمال کی جزا وسزا اور آدمی کی حیات وممات اسی قانون پر مبنی ہے۔ اس سلسلے میں بقائے اصلح اور بقائے انفع کے قانون الٰہی پر نہایت اہم بحث کی ہے۔

۱۰۔ **البرھان**: اس کا موضوع یہ ہے کہ جن دلائل فطریہ سے قرآن نے کام لیا ہے۔ ان سب کو

---

[1] تذکرہ، ص ۲۴۴، ۲۴۱ و ذکر آزاد، محولہ بالا ص ۲۸۶ [2] تذکرہ، ص ۲۲ [3] ذکر آزاد ص ۲۸۴
[4] ایضاً، ص ۲۸۳، ۲۸۴۔

یک جا کر کے دکھایا جائے کہ قرآن کا طریق استدلال کیا ہے[1]

۱۱۔ **الدین الخالص** : مولانا نے اس میں بتایا ہے کہ از روئے قرآن مذہب کا تصور کیا ہے[2]

۱۲۔ **حقیقتِ ایمان و کفر و نفاق** : یہ رسالہ کا نام نہیں، رسالہ کا موضوع ہے۔ اس میں مولانا نے انسان کی نفسی و قلبی حالت بلحاظ سعادت و شقاوت، ایمان، کفر اور نفاق بتائی ہے اور قرآن کی روشنی میں اس پر بحث کی ہے۔ تفسیر البیان میں یہ بحث خاص طور پر آئی تھی۔ رانچی کی نظر بندی کے زمانے میں اس موضوع پر ایک مستقل رسالہ بھی اتمام کو پہنچا تھا، تذکرہ میں چھ صفحے کا ایک نوٹ اس موضوع پر نہایت فکر انگیز اور ایمان افروز ہے[3]

۱۳۔ **سیرۃ نبویۃ ماخوذۃ من القرآن** : اب تو اردو میں متعدد ایسی کتب سیرۃ مرتب ہو گئی ہیں جن کا ماخذ قرآن حکیم ہے، لیکن اس کا خیال سب سے پہلے مولانا ہی کو آیا تھا۔ ابھی الہلال کا اجرا بھی عمل میں نہ آیا تھا حضرت علامہ شبلی سے سیرتِ نبوی کی تالیف کے موضوع پر گفتگو ہوئی تھی۔ اس وقت مولانا کو خیال ہوا تھا اور انہوں نے حضرت علامہ مرحوم سے کہا "آپ سیرت میں ایک خاص باب یا سیرت کا ایک خاص حصہ اس عنوان سے قرار دیجیے "قرآن اور سیرتِ محمدیہ" اور اس میں صرف آیاتِ قرآنیہ کو بہ ربط و ترتیب جمع کر کے دکھلایئے کہ خود قرآن سے کہاں تک حضور کی شخصیت اور آپ کے وقایع و ایام معلوم ہو سکتے ہیں؟ حضرت علامہ شروع میں تو اس خیال سے متفق نہیں ہوئے لیکن بعد میں انہوں نے اس موضوع کی اہمیت کا احساس فرمالیا اور مولانا آزاد ہی سے فرمایا کہ وہ ایک باب اسی انداز سے مرتب فرمادیں، چنانچہ مولانا نے اس طرف توجہ فرمائی اور کچھ مدت کی محنت کے بعد ایک مستقل کتاب مرتب فرمادی۔ مولانا فرماتے ہیں، کتاب کے مرتب ہو جانے کے بعد جو دیکھا تو ایک عجیب عالم نظر آیا۔ حیات و سیرت کا کوئی ٹکڑا ایسا نہیں ہے جس کے لیے قرآن میں ایک سے زیادہ آیات نہ ہوں"! مولانا نے سیرتِ نبویہ قرآنیہ کی صداقت و صحت کے معاملے کو منجملہ مہمات خصائص و اعجاز قرآن کے قرار دیا ہے۔ تذکرہ میں مولانا نے سیرت کے مطالعے کی اہمیت پر کئی صفحوں میں نہایت تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔ لیکن قرآن سے سیرتِ نبوی کی ترتیب اور اس کی اہمیت کے بارے میں ایک پوری فصل (نمبر ۲۲) تحریر فرمائی ہے۔ اس کا مطالعہ کرنا چاہیے[4]

---

[1] ایضاً، ص ۲۸۷ [2] ایضاً، ص ۲۸۸ [3] تذکرہ، محولہ بالا، ص ۱۸۵ تا ۱۹۰ [4] ایضاً، ص ۲۰۴ تا ۲۰۹۔

۱۴۔ **تفسیر سورۃ والتین** : سید وصی احمد بلگرامی کے ایک استفسار کے جواب میں مولانا نے سورۃ والتین کی تفسیر کے جو حقائق بیان فرمائے[۱] ان کی جامعیت ایک رسالہ کی ترتیب کی مقتضی تھی، چنانچہ ایک صاحب نے اسے حقائق سورۂ والتین کے نام سے رسالے کی صورت میں چھاپ بھی دیا تھا۔

اگرچہ ان رسائل میں سے بیشتر ہمارے علم کے مطابق آج دنیا میں موجود نہیں۔ بعض رسائل پولیس کی خانہ تلاشیوں میں ضایع ہو گئے اور بعض شاید مولانا کی زندگی میں ان کی عدم موجودگی میں اور بعض شاید مولانا کی وفات کے بعد ان کے کاغذات سے ادھر ادھر ہو گئے ہوں لیکن قرآن حکیم کے اسرار و حکم اور علوم و معارف پر ترجمان القرآن، تفسیری مقالات و مضامین اور الہلال والبلاغ کی تحریرات میں جو کچھ مولانا نے چھوڑا ہے وہ خود اتنا بڑا ذخیرہ ہے کہ مولانا کے افادات و افکارِ قرآنی کے کئی رسائل تمام معنوی خوبیوں کے ساتھ مرتب کر دیے جا سکتے ہیں۔

۴۔ یہ تو مولانا کی مصنفات و مولفات کا ذکر تھا پہلے ذکر آ چکا ہے کہ الہلال دعوت الی القرآن کا ترجمان تھا۔ البلاغ کا مقصد وحید دعوتِ الہلال کا احیاء تھا۔ ان کی علمی مصروفیات میں سب سے بڑی مصروفیت یہی تھی۔ ان کی تصنیفات و تالیفات میں کسی ایک موضوع پر سب سے زیادہ رسائل اور سب سے بڑے علمی کارنامے کا تعلق قرآن حکیم سے ہے۔ الہلال میں خاص تفسیری مقالات کے علاوہ اس کے مختلف ابواب میں مستقلاً اور ضمناً جو موضوع سب سے زیادہ زیر بحث آیا، وہ قرآنِ حکیم کے علوم و معارف اور اسرار و حکم تھے۔

عملی میدان میں حزب اللہ اور اس کے ذیلی ادارے دار الارشاد کے قیام کا مقصد دعوت و ارشاد قرآن کے سوا کچھ اور نہ تھا۔ نظارۃ المعارف القرآنیہ، دہلی کے قیام میں، وہ جس کے بانیوں میں سے تھے، ابو محمد مصلح (حیدر آباد دکن) کی تحریکِ قرآن میں جو ان کے خوابوں کی تعبیر تھی، مولانا نے اسی یوسفِ مقصود کی جھلک دیکھی تھی، وہ جہاں بھی رہے اور جس حال میں بھی رہے، قرآنِ حکیم کے عشق نے انہیں بے چین رکھا۔ نظم جماعت کی تحریک انہوں نے سلطانِ قرآن کے عشق میں شروع کی تھی۔[۲]

---

[۱] ۔ البلاغ شمارہ ۱۲، ص ۱۹۸۔ [۲] تفصیل کے لیے دیکھیے "تحریکِ نظم جماعت"۔ مولانا ابو الکلام آزاد، از ابو سلمان شاہجہانپوری شایع شدہ لاہور ۱۹۷۷ء

امارت شرطیہ کے وجود سے انہوں نے قرآنی و اسلامی اجتماعی زندگی کے قیام کی امیدیں وابستہ کی تھیں۔ تحریکِ خلافت کے اجراء سے قرآن کی تعلیم کے مطابق حفظ و دفاعِ اسلام و مرکز خلافت کا مقصد انہوں نے حاصل کرنا چاہا۔ جمعیت علمائے ہند کے قیام میں انہوں نے اسی خواب کی تعبیر دیکھی تھی اور اس کے تیسرے سالانہ اجلاس لاہور (۱۹۲۱ء) میں انہوں نے یہی صدائے حق و احیائے علم و عمل کتاب و سنت بلند کی تھی۔ مولانا فرماتے ہیں :

"مسلمانوں کی قومیت صادقہ کی بنیاد صرف شریعت کا علم و عمل ہے۔ شریعت نے انہیں بتلایا تھا کہ دنیا کی سب سے بڑی قوم وہی ہیں، وہی خیر الامم ہیں، وہی خیر البریۃ ہیں، وہی شہداء علی الناس ہیں، وہی شہداء اللہ فی الارض ہیں۔ ان کے عروج و سعادت کی علت صرف یہ تھی کہ قرآن حکیم اور سنت رسول کو انہوں نے اپنا دستور العمل حیات قرار دیا تھا۔ قرآن کی نسبت صاحب قرآن کا اعلان تھا۔ ان اللہ یرفع بھذا الکتاب اقواما ویضع بہ اٰخرین" (رواہ مسلم) اللہ تعالیٰ اس کتاب کی ہدایت سے قوموں کو اٹھائے گا اور یہی ہے جس کو ترک کر کے قومیں گریں گی اور ہلاک ہوں گی۔ اور روایت حضرت علی عند ترمذی و ابو نعیم و الطبرانی فی الکبیر میں فرمایا وھو الفصل لیس بالھزل، من ترکہ من جبار قصمہ اللہ، ومن ابتغی الھدی فی غیرہ اضلہ اللہ" الی ان قال" من قال بہ صدق، و من عمل بہ اجر، ومن حکم بہ عدل، ومن دعا الیہ ھدی الی صراط مستقیم۔ پس جب مسلمانوں نے قرآن و سنت کا علم و عمل ترک کر دیا تو اقبال و عروج نے بھی ان سے کنارہ کشی کر لی یہ مسلّم اور حقائق تاریخیہ میں سے ہے کہ مسلمانوں کے عروج و اقبال کا سب سے بہتر دار فع زمانہ وہی تھا، جب بجز کتاب و سنت کے علم و عمل کے اور کوئی تعلیم ان کی رہنما نہ تھی (یعنی عہد صحابہ و خلفاء راشدین، "اولئک اصحٰب محمد ابر ھذہ الامۃ قلوبا و اعمقھا علما واقلھا تکلفا قوما اختارھم اللہ بصحبۃ نبیہ و اقامۃ دینہ، فاعرفوا لھم حقھم و تمسکوا بھدیھم، فانھم کانوا علی الھدی المستقیم" (قال ابن مسعود رضی اللہ عنہ) اور تنزل و فساد کا

عہد اسی وقت سے شروع ہوا جب کہ اقوام ماضیہ مغضوبہ کے علوم و اعمال بشکل علوم دخیلہ و اعمال بدعیہ میں رائج ہوئے۔ پس اگر اب بھی مسلمان اپنے عروج رفتہ کو دوبارہ حاصل کر سکتے ہیں، تو اس کی صرف ایک ہی راہ ہے، اس کے علاوہ جس قدر راہیں بھی کھلیں گی، گمراہی و فساد کی ہوں گی یعنی علم و عمل شریعت کا احیاء، اور ترک و ہجر شریعت کا انسداد۔

اس مسلک کی بنیاد اس ایمانی اور اعتقادی حقیقت پر مبنی تھی کہ شریعت اسلامیہ آخری و اکمل شریعت ہے اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی اور اس کا وعدہ ہے لیظہرہ علی الدین کلہ یقیناً اس وعدہ کا ابھی ظہور نہیں ہوا۔ پس ضرور ہے کہ وعدۂ الٰہی ظاہر ہو، اور اس لیے مستقبل کے لیے اگر کوئی راہ فوز و فتح ہو سکتی ہے تو وہ صرف دعوتِ شریعت اور احیاء عمل بالقرآن ہی ہے"[1]

اس کے بعد "اصلاح دینی کے گزشتہ ایام" کے زیر عنوان ملک اور بیرون ملک کی متعدد دعوات و تحریکات کے عزائم اصلاح و احیائے ملی، ان کے نقائص، اور ان کی ناکامیوں کے اسباب کا ذکر فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ازاں جملہ سب سے بڑا نقص ان تمام دعوتوں میں یہ رہا کہ گو اصلاً اصلاح دینی کی قسم میں داخل تھیں لیکن بمصداق خلطوا عملا صالحا و اخر سیئا۔ جو طریق عمل اختیار کیا گیا تھا وہ ٹھیک ٹھیک نہج قویم و مستقیم پر نہ تھا یعنی منہاج و اسوۂ نبوت کے علوم و اعمال کو ان میں غلبہ و احاطہ حاصل نہ تھا اور کتاب و سنت کی دعوت خالص و بے آمیزش کی جگہ موجودہ عہد کے طرق محدثہ نے ان میں راہ پالی تھی۔"[2]

نظرِ واپسیں:

مولانا نے اپنے اس عقیدے کا الہلال میں، البلاغ میں، مختلف مقالات و مباحث میں اور ترجمان القرآن میں بار بار اظہار کیا تھا کہ مسلمانوں کی اصلاح اور شرعی و اسلامی زندگی کے قیام کے لیے سب سے ضروری چیز یہ ہے کہ وقت کی ضروریات کے مطابق قرآن حکیم کی تعلیم و اشاعت کا

---

[1] خطبۂ صدارت تحریری، میرٹھ، قومی دارالاشاعت، صفحہ ۲۶، ۲۷۔ [2] ایضاً صفحہ ۲۹۔

سروسامان ہو۔ ترجمان القرآن کی پہلی جلد شائع کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا تھا:

"سولہ برس ہوئے، میں نے اس کام کی ضرورت محسوس کی تھی اور کام بھی شروع کر دیا تھا لیکن افسوس کہ چند در چند موانع پیش آتے رہے اور کام انجام نہ پا سکا لیکن اب کہ توفیقِ الٰہی سے ترجمان القرآن مکمل ہو کر شایع ہو رہا ہے، میں محسوس کرتا ہوں کہ مسلمانوں کی اصلاح کے وہ تمام دروازے کھل رہے ہیں جو ہماری کوتاہیٔ عمل سے اس وقت تک بند تھے"۔[1]

لیکن کیا مولانا ترجمان القرآن شایع کر کے مطمئن ہو گئے تھے؟ مولانا کے نزدیک یہ کام کی محض ابتدا تھی اور تکمیل کار کے لیے بہت کچھ کرنا اور ہونا باقی تھا۔ مولانا نے ترجمان القرآن کی اشاعت ــــ آغاز کار کے بعد جو نقشہ کار بنایا تھا اسے پانچ دفعات میں مرتب کر دیا تھا۔ ان کے نزدیک قرآن حکیم کی تعلیم واشاعت کا مقصدِ عظیم پورا نہیں ہو سکتا۔ جب تک یہ امور انجام نہ پائیں۔

۱۔ عام مطالعہ واشاعت کے لیے ضروری تھا کہ ترجمان القرآن کو مختلف صورتوں، مختلف ترتیبوں، اور مختلف قسم کے ایڈیشنوں میں، اس طرح اور اتنی بڑی تعداد میں شایع کیا جائے کہ مسلمانوں کا ہر طبقہ اور ہر فرد اس سے فائدہ اٹھا سکے، اور کوئی مسلمان گھر اس سے خالی نہ رہے۔

۲۔ ضروری ہے کہ قرآن کے تمام اصولی مباحث از سرِ نو مدوّن کیے جائیں۔ مثلاً اس کی زبان، اس کی ادبی خصوصیات، اس کا اسلوب بیان، اس کے مقاصد ومہمات اس کا طریق استدلال، اس کے قصص وامثال، اس کے نزول وکتابت کی تاریخ وغیرہا، اور اب کہ ترجمان القرآن کی ترتیب ان مباحث کی ایک مقررہ تحقیقات کے ماتحت مکمل ہو چکی ہے۔ نہایت آسانی کے ساتھ یہ پورا سلسلہ مرتب کیا جا سکتا ہے۔

۳۔ ضرورت اس کی تھی کہ قرآن کے اسلوب بیان اور طریقِ استدلال کی تنقیح کے بعد ایسے ابواب و عناوین ترتیب دیے جائیں جن کے نیچے مطالب قرآنی کی ہر قسم الگ الگ جمع کی جا سکے اور قرآن کی ہر تعلیم اپنی شکل ونوعیت میں نمایاں ہو جائے۔ اب کہ ترجمان القرآن مرتب ہو چکا ہے۔ نہایت آسانی کے ساتھ ابواب ومضامین کی مکمل تبویب عمل میں آ سکتی ہے اور انہیں یکجا اور علیحدہ علیحدہ کیا جا سکتا ہے۔

۴۔ ایک ایسی کتاب کے لیے جو حوالہ اور استشہاد کی کتاب ہو، ضروری ہے کہ استخراج مطالب و الفاظ کی تمام سہولتیں بہم پہنچائی جائیں مثلاً قرآن کے لیے ایڈیشن مرتب کیے جائیں جو حوالہ جات (رفرنس)

---

[1] ترجمان القرآن جلد اول، صفحہ ۸۴۔

کے ساتھ ہوں، یا مثلاً قرآن کے الفاظ و اسماء اور مطالب و آیات کے انڈکس مرتب کیے جائیں جو ہر پہلو جامع اور مکمل ہوں، یا مثلاً قرآن میں جس قدر جغرافیائی اور تاریخی اشارات ہیں، ان کے نقشے تیار کیے جا تاکہ ان مقامات کی قدیم و جدید جغرافیائی حیثیت بہ یک نظر واضح ہو جائے۔ ہم سے پہلے یورپ کے بعض مستشرقوں نے ان کاموں کی ضرورت محسوس کی لیکن اب تک جو کچھ ہوا ہے، ناکافی ہے اور ضروری ہے ک ازسرِ نو یہ کام انجام دیے جائیں۔

۵۔ سب سے آخر مگر بہ اعتبار اہمیت سب سے پہلا کام یہ ہے کہ دنیا کی تمام زبانوں میں قرآن کے ترجمے مرتب کیے جائیں، اور بڑی سے بڑی تعداد میں ان کی اشاعت کا سروسامان ہو، کم از کم مغرب و مشرق کی ان زبانوں میں جو موجودہ اقوام ارضی کی اہم زبانیں تسلیم کی جاتی ہیں۔[۱]

مولانا کے خیال میں یہ کام بغیر اس کے انجام نہیں پا سکتا تھا کہ قرآن کی خدمت اشاعت کے لیے ایک علمی اور اشاعتی ادارہ قائم کیا جائے جب تک ایک ایسا ادارہ وجود میں نہیں آجاتا۔ قرآن حکیم کی تعلیم و اشاعت کا مقصدِ عظیم پورا نہیں ہو سکتا۔

آج ان تمام اصحاب کے لیے جو امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد علیہ الرحمۃ سے عقیدت رکھتے ہیں اور ذوق تمسک بالکتاب والسنۃ میں ہم رشتۂ آزاد ہیں۔ ضروری ہے کہ ان افکار پر غور فرمائیں اور سوچیں کہ مولانا سے عقیدت اور آج کے حالات میں وقت کا تقاضا اور مسلمانوں کی اصلاح کا سب سے ضروری کام کیا ہے اگرچہ ترجمان القرآن کی اشاعت اور حضرت امام الہند کے انتقال کے بعد لیل و نہار کی بہت سی گردشیں گزر چکی ہیں اور زمانہ کہیں سے کہیں پہنچ گیا ہے لیکن مسلمانوں کی تعلیم و اصلاح کی ضرورت میں کوئی تغیر پیدا نہیں ہو گیا، بلکہ آج اس کی ضرورت پہلے سے بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ ضرورت ہے کہ علم و عمل قرآن کی ایک نئی تحریک پیدا کر دی جائے۔ اس سلسلے میں خدمتِ قرآن کے ان تمام علمی و عملی پہلوؤں پر غور کیا جائے جن کی طرف مولانا نے اپنے مقالات و مصنفات میں توجہ دلائی ہے۔ اس کے بہت سے اصول و مبادی اور جوامع و کلیات خود مولانا کی تحریروں سے مدوّن کر لیے جا سکتے ہیں۔

جو حضرات مولانا آزادؒ سے ارادت و محبت کے مدعی ہیں انہیں عزم کر لینا چاہیے کہ علم و عمل اور دعوت و ارشادِ قرآن کے وہ تمام کام انجام دیں گے جنہیں مولانا مسلمانوں کی عملی زندگی میں نقش پذیر دیکھنا چاہتے تھے۔

---

[۱] ترجمان القرآن، جلد اوّل، محولہ بالا، ص ۵۵۔

مولانا آزاد کے فلسفہ اجتماعیات میں علم و عمل قرآن کی اہمیت

"مسلمانوں نے قرآن پاک کی تفسیریں بہت لکھیں اور شاید ایک بھی نہیں لکھی "شاید" اس لیے کہ سلف کی تفسیریں ناپید ہیں۔ اس لیے ان پر حکم لگانا احتیاط کے خلاف ہے۔ بہرحال کتب تفسیر اور علماء کی تفسیری تصنیفات جہاں تک نظر سے گزری ہیں۔ علامہ ابن تیمیہ اور حافظ ابن قیمؒ اور خاص ادب اعجاز کے لحاظ سے ابو الفتح عبدالکریم موصلی (مصنف المثل السائر) اور متاخرین میں حضرت شاہ ولی اللہ سے بہتر قرآن کے محقق نگاہ میں نہیں جچے۔

علامہ ابن تیمیہ اور حافظ ابن قیم کی مستقل تفسیریں تو ناپید ہیں لیکن یوں ان کی ہر تصنیف قرآن پاک کی تفسیر کا ایک ٹکڑا ہے۔ علاوہ ازیں علامہ ابن تیمیہ کی تفسیر سورۂ اخلاص معوذتین اور سورۂ نور الگ بھی چھپ گئی ہے۔ ان کتابوں سے ان بزرگوں کی طرز تفسیر کا پتہ بخوبی چلتا ہے۔

بات یہ ہے کہ عموماً تفسیریں دو ہی قسم کی لکھی گئی ہیں، یا محض روایتی و نقلی جیسے ابن جریر طبری، ثعالبی، قرطبی، بغوی، ابن کثیر وغیرہ، یا تمامتر عقلی جیسے تفسیر کبیر، ابو مسلم نیشاپوری، راغب اصفہانی، امام رازی، نیشاپوری، مدارک و بیضاوی وغیرہ لیکن ایسی تفسیر جس میں عقل و نقل کی پوری احتیاط آمیزش ہو اور جس میں اگر روایتیں ہوں، تو وہ بھی روایت و درایت سے پوری اور عقلیات ہوں تو افلاطون اور ارسطو کی پیروی سے آزاد اگر لکھی گئی تو علمائے اسلام میں یہ سعادت علامہ ابن تیمیہ اور حافظ ابن قیم کے سوا کسی اور کو نصیب نہیں ہوئی۔"[1]

---

[1] سلیمان ندوی سید، ترجمان القرآن (مقالہ) ابوالکلام آزاد (مرتبہ عبداللہ بٹ) ۱۹۴۳، ص ۸۲

یہ سطریں حضرت علامہ سید سلیمان ندوی کی اس تحریر سے ماخوذ ہیں جو انھوں نے مولانا ابوالکلام آزاد کے ترجمان القرآن پر تبصرے کی تمہید کے طور پر لکھی تھی۔ اس تمہید کے بعد سید صاحب نے مولانا آزاد کے انداز تفسیر پر ان الفاظ میں اظہار خیال فرمایا ہے

"مصنف ترجمان القرآن کی یہ دیدہ وری داد کے قابل ہے کہ انہوں نے وقت کی روح کو پہچانا۔ اور اس فتنۂ فرنگ کے عہد میں اس طرز و روش کی پیروی کی جس کو ابن تیمیہ اور ابن قیم نے فتنۂ تاتار میں پسند کیا تھا، اور جس طرح انہوں نے اس عہد کے مسلمانوں کی تباہی کا راز فلسفۂ یونان کی دماغی پیروی کو قرار دیا اسی طرح اس عہد کے مسلمانوں کی بربادی کا سبب ترجمان القرآن کے مصنف نے فتنۂ یونان و فرنگ کی ذہنی غلامی کو قرار دیا، اور نسخۂ علاج وہی تجویز کیا کہ کلام الٰہی کو رسول کی زبان و اصطلاح اور فطرت کی عقل اور فلسفہ سے سمجھنا چاہیے۔"[1]

اس کے بعد سید صاحب نے سورۂ فاتحہ (امّ الکتاب) کی تفسیر پر مفصل اور ترجمان القرآن پر اجمالی تبصرہ فرمایا ہے۔ سورۂ فاتحہ کی تفسیر کے بارے میں سید صاحب نے ان الفاظ میں اظہار خیال فرمایا ہے۔

"اس میں سورۂ فاتحہ کے ایک ایک لفظ کی ایسی دلنشیں تشریح، اور بصیرت افزا تفسیر ہے کہ اس سے اس سورہ کے امّ الکتاب (اصل قرآن) ہونے کا مسئلہ مشاہدۃً معلوم ہونے لگتا ہے، اور اسلام کے تمام مہماتِ مسائل اور اصولِ دین پر ایک نظر ہو جاتا ہے، خصوصاً قرآنِ پاک کے طرزِ استدلال، خالقِ کائنات کی ربوبیت و رحمت کے آثار و دلائل اتنی تفصیل سے لکھے ہیں کہ مصنف کی وسعتِ علم و نظر کی داد بے اختیار دینی پڑتی ہے اور امام غزالی نے "الحکمۃ فی المخلوقات اللہ تعالیٰ" اور ابن قیم نے "مفتاح دار السعادۃ" میں اس مبحث پر جو کچھ لکھا تھا، اس سے زیادہ بسط و تشریح اور مقتضیات زمانہ کی مطابقت سے "ترجمان القرآن" میں یہ بحث آگئی ہے۔ چنانچہ توحید اور دلائلِ توحید، نیز تخلیق بالحق، الہدیٰ اور الدین

---

[1] سلیمان ندوی، سید: ترجمان القرآن (مقالہ) ابوالکلام آزاد (مرتبہ عبداللہ بٹ) ۱۹۴۳ء ص ۸۳

کی مصنف نے جو قرآنی تشریحیں کی ہیں، وہ اگر ایک طرف نکتہ پرور ہیں، تو دوسری ایمان پرور ہیں"[1]

آخر میں پورے ترجمان القرآن کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"ترجمان القرآن وقت کی اہم چیز ہے۔ ضرورت ہے کہ اس کو گھر گھر پھیلایا جائے اور نوجوانوں کو اس کے مطالعہ کی ترغیب دی جائے ہر اسلامی دارالمطالعہ میں اس کا ایک نسخہ منگوا کر رکھا جائے"[2]

لیکن یہاں میرا مقصد مولانا آزاد کے اس شاہکار پر تبصرہ نہیں بلکہ اس طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ قرآن حکیم مولاناؒ کے فلسفۂ اجتماعیات میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے اور مولانا کے تمام افکار و تعلیمات کا یہ محور ہے۔ برصغیر میں اسلامی اور دینی علوم و معارف کی تعلیم و اشاعت کی ایک طویل تاریخ ہے جس کا سرا آغاز سندھ میں مسلمانوں کی پہلی اسلامی حکومت کے عہد قیام تک جا پہنچتا ہے۔ لیکن قرآن حکیم کی تعلیم و اشاعت کی تحریک امام الہند شاہ ولی اللہ محدث دہلوی سے شروع ہوتی ہے۔ ان کے بعد ان کے ابناء عظیم میر شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر کی خدمات جلیلہ دعوت و تعلیم قرآن کی تاریخ کا ایک اہم موضوع ہیں۔ لیکن اگر صرف بیسویں صدی میں دعوت قرآن کی تحریک پیش نظر ہو تو مولانا ابوالکلام آزاد کے سوا کوئی دوسری شخصیت نظر نہیں آتی جس کے سر دعوت قرآن کے آغاز، ذوق قرآن کی تربیت اور فہم و تمسک بالکتاب کے فتح باب کا سہرا باندھا جائے۔ اپنی اس بات کو مدلل کرنے کے لیے حضرت سید سلیمان ندوی ہی کے افکار مستعار لیتا ہوں۔ سید صاحب فرماتے ہیں:

"اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ نوجوان مسلمانوں میں قرآن پاک کا ذوق مولانا ابوالکلام کے الہلال و البلاغ نے پیدا کیا، اور جس اسلوب بلاغت، کمال انشاپردازی اور زور تحریر کے ساتھ انہوں نے انگریزی خوان نوجوانوں کے سامنے قرآن پاک کی ہدایت کو پیش کیا۔ اس نے ان کے لیے ایمان و یقین کے نئے نئے دروازے

---

[1] سلیمان ندوی، ترجمان القرآن (مقالہ)، ابوالکلام آزاد (مرتبہ عبداللہ بٹ) ۱۹۴۳ء ص ۸۴، [2] ایضاً ص ۸۵

کھول دیے اور ان کے دلوں میں قرآن پاک کے معانی و مطالب کی بلندی اور وسعت کو پوری طرح نمایاں کر دیا۔[1]

سید صاحب نے بیسویں صدی میں تاریخ دعوت قرآنی کے جس پہلو کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس کا اعتراف وقت کے تمام اکابر اور اہل قلم نے کیا ہے۔ میں صرف سامنے کے چند حوالوں کی طرف اشارہ کر دوں گا تاکہ آئندہ سلسلہ مطالب کے لیے ایک کڑی مہیا ہو جائے اور ربط کا کام دے۔

فضل الدین احمد جن کی بدولت ہمیں تاریخ عزیمت دعوت کا شاہکار "تذکرہ" نصیب ہوا جس کی تحریر و انشاء کی رنگینیوں اور اسلوب کی دلربائیوں نے ہمارے ذوقِ ادبی کی تسکین کے لیے ایک شالامار سجایا اور مباحث کی دلآویزی اور معنی کی بلندی نے ہمارے قلوب کو عزائم اور جذبات ایثار سے معمور اور ہمارے جسموں کو شدائدِ وقت و جبر کے تحمل کے لیے آمادہ کر دیا ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اس میں شامل اصحاب سیرت کے تذکار مقدسہ کے سامنے انفاقِ جان و مال کا بڑے سے بڑا عمل بھی ہیچ نظر آنے لگا ہے۔ ہاں! وہی فضل الدین احمد جو تذکرہ کا محرک و موجب تھے اور تذکرہ کے ساتھ جن کا نام زندہ جاوید رہے گا "تذکرہ" کے مقدمہ میں "عام مذہبی انقلاب" کے زیر عنوان لکھتے ہیں۔

"الہلال کا سب سے بڑا کارنامہ جو ہمیشہ تاریخ ہند میں یادگار رہے گا، وہ پائیدار مذہبی انقلاب ہے جو یکایک مسلمانوں میں دعوتِ حق سے پیدا ہو گیا۔ لاکھوں کروڑوں مسلمان ہمیشہ قرآن شریف پڑھتے پڑھاتے رہتے ہیں مگر قرآن کی اصل حقیقت سب سے پہلے اسی نے آشکارا کی اور یکایک سب کے دل میں یہ بات اُتر گئی کہ ہماری دینی و دنیوی ترقی کی وہی راہ صحیح ہو سکتی ہے جو اس کی رہنمائی سے کھلی ہو۔ رسمی طور پر یہ بات پہلے بھی کہی جاتی تھی لیکن اس طرح کسی نے نہیں بتلائی تھی کہ جاہل سے لے کر عالم تک، سب کے دلوں کو مسحور کرے اور سب بے اختیار ہو کر اس کی طرف کھنچے جائیں۔ اس نے نہ صرف اس کی پکار بلند کی بلکہ قومی زندگی کی ہر بات میں قرآن کی تعلیم دنیا کے سامنے پیش بھی کر دی اور ہر طرف سے ہٹا کر قوم کو صرف

---

[1] سلیمان ندوی، سید: ترجمان القرآن (مقالہ) ابوالکلام آزاد (مرتبہ عبداللہ بٹ) ۱۹۴۳ء ص ۸۰۔

مذہب کی سچی راہ پر لگا دیا۔ سیاست، معاشرت، تعلیم، ساری باتوں کی اصلی بنیاد صرف مذہب اور قرآن کی تعلیم قرار پا گئی۔ گو ابتدا میں بہت سے لوگوں نے مخالفتیں بھی کیں لیکن رفتہ رفتہ سب نے اس کے آگے سر جھکا دیا اور آج تمام مسلمانوں پر جو رنگ چھایا ہوا ہے، خواہ اس کا ظہور سیاسی مباحث میں ہو، یا کسی دوسری شکل میں مگر سب چل رہے ہیں اسی راہ پر۔

سب سے زیادہ یادگار اور تعجب انگیز اثر اس نے دو جماعتوں پر ڈالا اور یہی دونوں جماعتیں تمام قوم کے لیے بمنزلہ اصل و بنیاد کے ہیں یعنی علماء و مشائخ کا گروہ، اور انگریزی تعلیم یافتہ جماعت۔ اگر الہلال شائع ہو کر اور کوئی کام نہ کرتا، صرف ایک عالم ایک پیر، ایک با اثر جدید تعلیم یافتہ شخص کو اس رنگ میں رنگ دیتا۔ جس میں اس نے تمام قوم کو رنگ دیا ہے تو صرف یہی کارنامہ اس کی انقلابی قوت کے اعتراف کے لیے کافی تھا۔ علماء و مشائخ کا گروہ جو اپنے مدرسوں اور حجروں سے کبھی جھانک کر بھی دنیا کی حالت پر نظر نہیں ڈالتا تھا۔ الہلال نے ان کو یکایک نکال کو جدوجہد کے میدانوں میں کھڑا کر دیا۔ اور ان میں سے ہر شخص نے محسوس کر لیا کہ ہم اپنے اصلی فرض کو آج تک بھولے ہوئے تھے، تعلیم یافتہ جماعت کا یہ حال ہوا کہ یا تو یہ گروہ مذہب کے نام سے متوحش تھا، اب ہزاروں سر خدا کے آگے جھک گئے اور بعض کا تو یہ حال ہوا کہ بڑے بڑے عابدوں، زاہدوں کو اپنے پیچھے چھوڑ دیا۔ شب و روز قرآن کی صدائیں ان کی زبانوں سے نکلنے لگیں۔ اس بارے میں جیسے جیسے عجیب واقعات دیکھے اور سنے گئے ہیں اور الہلال کے ایک ایک مضمون بلکہ ایک ایک سطر نے جیسے جیسے ہوش ربا اثر لوگوں پر ڈالے ہیں ان کو اگر بیان کیا جائے تو پورا ایک رسالہ بن جائے۔[1]"

فضل الدین احمد نے چند اکابر مثلاً حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی، علامہ اقبال مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی کے اعتراف اور انقلاب فکر و حال کی مثالیں بھی دی ہیں۔ علامہ

۱۔ فضل الدین احمد، مقدمہ تذکرہ (مولانا آزاد) دہلی ساہتیہ اکادمی ۱۹۶۸ء ص ۱۴، ۱۵

اقبال مرحوم کے بارے میں تو انھوں نے یہاں تک لکھا ہے کہ ان کی اسرارِ خودی اور رموزِ بیخودی دونوں مثنویاں فی الحقیقت الہلال کی صدا و دعوت قرآن ہی کی بازگشت ہیں[1] عبد اللہ بٹ مرحوم کے فکر و مطالعہ کا ایک بھی ایسا دل آویز گوشہ ہے کہ یہاں تک پہنچ کر اس پر نظر ڈالے بغیر گذر جائے مناسب نہیں۔ الہلال کی خدمات کے بارے میں لکھتے ہیں

"الہلال" مسلمانوں میں مذہبی انقلاب کا داعی تھا۔ اس نے قومی زندگی کے ہر شعبہ میں قرآن مجید کی تعلیم پیش کی، اور سیاست، معاشرت، تعلیم، غرض مسلمانوں کی قومی زندگی کی تعمیر کے لیے قرآن مجید ہی کو بنیاد قرار دیا۔ اس کی آواز کا اثر یہ ہوا کہ علماء و مشائخ جو اپنے حجروں سے جھانک کر باہر کی دنیا پر نظر نہ ڈالتے تھے، اب انہیں اپنے بھولے ہوئے فرض کا احساس ہوا۔ تعلیم یافتہ طبقہ جو مذہب سے متنفر تھا، خدا کی عبادت میں بڑے بڑے زاہدوں سے بھی چار قدم آگے نکل گیا۔ قرآن کریم کے مطالعہ کا شوق عام ہو گیا، اور قرآن کی اصل روح کو پہچاننے کی جستجو بڑھ گئی۔ یہ عظیم الشان انقلاب صرف ابوالکلام کی عظیم الشان شخصیت کا مرہونِ منت ہے۔ ع نگاہ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں۔

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی نے الہلال کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ "ہم سب اپنا اصلی کام بھولے ہوئے تھے، الہلال نے یاد دلایا" مولانا محمد علی نے ابتداء میں علی گڑھ کے سلسلہ میں "الہلال" کی مخالفت میں مضمون لکھے لیکن بعد میں خود اس پالیسی پر کاربند ہوئے جو "الہلال" نے پیش کی تھی۔ مولانا شوکت علی تو اکثر کہا کرتے تھے "ابوالکلام نے ہم کو ایمان کا راستہ بتلا دیا ہے"[2]

مولانا حنیف ندوی سے میری عقیدت اور رشتۂ نیاز ایسا نہیں کہ میں اس مقام پر فلسفہ و حکمت کے اس آشنا، علوم و معارفِ دینی کے اس عالم، تاریخ دعوت قرآنی کے اس نکتہ رس، اور مولانا ابوالکلام آزاد کے مقام اور ان کی دعوت اصلاح و جہاد ملی کے اس آشنا سا سے

[1] فضل الدین احمد، مقدمہ تذکرہ، محولہ بالا، ص ۱۵، ۱۶ [2] عبد اللہ بٹ، ابوالکلام آزاد، محولہ بالا ص ۲۰۶، ۲۰۷

استفادہ کیے بغیر گزر جاؤں۔ مولانا حنیف ندوی صاحب ارشاد فرماتے ہیں۔

"مولانا نے شاہ ولی اللہ کے بعد پہلی دفعہ کتاب و سنت کی آواز اس دلکشی اور معقولیت سے پیش کی اور ان تمام قلعوں کو جن کو سرسید اور ان کے قابل رفقاء نے بڑی محنت سے تیار کیا تھا ایک ہی جنبش سے گرا دیا۔ سرسید کی آواز صرف ان لوگوں تک پہنچی جو پہلے سے اس قسم کی آواز سننے کے لیے تیار تھے مگر مولانا ہر دل تک پہنچے۔ مسدس حالی کے بعد "الہلال" وہ مرقع منثور ہے جس نے اسلامی احساسات کو بیدار کیا، اور مسلمانوں کے لیے بہترین غذائے روح کا اہتمام کیا۔ مسدس کے اشعار جس طرح از بر یاد تھے اسی طرح مولانا کے وہ مرصع پر زور فقرے اور بلیغ جملے، خواص کی محفلوں میں مزے لے لے کر پڑھے اور دہرائے گئے۔ مولانا نے ایک طرف، علی گڑھ تحریک کی مخالفت کی، سرسید کی مذہبی معذرت خواہ پالیسی کی تردید کی اور دوسری طرف سیاسی اعتبار سے مسلمانوں میں خود اعتمادی اور خودداری کے جذبات پیدا کیے۔ آج جس قدر بولنے والی زبانیں خوددارانہ انداز میں سوچنے والے دماغ اور اسلامیات پر لکھنے والے قلم ہیں، ان سب کی تعمیر و تربیت میں "الہلال" نے بڑا حصہ لیا ہے۔ ان سب کو گویائی اور صحیح انداز فکر الہلال نے بخشا ہے۔

اس کی اشاعت اور اس کے یقین پرور مقالوں سے نفسیاتی طور پر اس قسم کی فضا پیدا ہو گئی کہ لوگوں نے پھر سے اسلامی علوم و معارف اور اسلامی تاریخ و رجال کو عزت و توقیر کی نظروں سے دیکھنا شروع کر دیا۔ بلکہ یہ شوق پیدا ہوا کہ اسی انداز میں از سرِ نو تمام تنظیماتِ اسلامیہ کو مرتب کیا جائے۔ مولانا نے اس میں اگرچہ ہر نوع کے مضامین لکھے اور ادبی ثقافتی، تاریخی اور سیاسی میدانوں میں اپنی جولانیٔ طبع کے جوہر دکھائے، مگر قرآن کی آیات کی تفسیر اور ان کے موزوں استعمال میں آپ نے جو جدت پیدا کی وہ آپ کی مایۂ ناز خصوصیت ہے۔ آپ نے مضامین میں آیاتِ قرآن کو اس طریق سے استعمال کیا کہ ان میں ایک نئی معنویت پیدا ہو گئی"[۱]

الہلال کی یہی خدمات اور خصوصیات تھیں جن کی وجہ سے وہ حضرت شیخ الہند

---

[۱] حنیف ندوی، مولانا محمد، چند خیالات (مقالہ) ابوالکلام آزاد (مرتبہ عبداللہ بٹ) محولہ بالا، ص ۶۹-۱۶۸

کا محبوب تھا، مولانا شوکت علی اور محمد علی جس کے معترف تھے جس سے استفادے کی وجہ سے مولانا محمد علی نے اس کے ایڈیٹر کو اپنا استاد کہا تھا[۱] اور علامہ اقبال مرحوم جس کے شیدائی اور قدر دان تھے اور نہ صرف اس کے مطالعے کا ذوق رکھتے تھے بلکہ اس کی دعوت کو عام کرنے کے لیے اس کے متعدد خریدار فراہم کیے تھے[۲]۔

مولانا آزاد کے الہلال والبلاغ کے یہی وہ خصائص حسنہ اور خدمات جلیلہ ہیں جنھوں نے گزشتہ دور کے اکابر و اہل علم و تہذیب سے لے کر موجودہ دور کے ارباب فضل و کمال اور اصحاب ذوق تک کو اس کا مداح و معترف بنا دیا ہے۔ لیکن یہ بات کہ مولانا آزاد کے فلسفہ اجتماعیات میں قرآن حکیم کی تعلیم و اشاعت اور علم و تمسک کی کیا حیثیت تھی ہمیں خود مولانا کی تحریروں کے آئینے میں دیکھنا چاہیے۔ الہلال کے ایک قاری کے جواب میں الہلال کی دعوت کے تعارف میں انھوں نے ایک طویل مقالہ سپرد قلم کیا تھا۔ اس میں لکھتے ہیں:

"اس نے (الہلال) روز اول ہی سے اعلان کر دیا ہے کہ احیاء و تجدید ملت کے لیے جس قدر تحریکیں ملک میں موجود ہیں۔ وہ ان میں سے کسی کو بھی تنزل و انحطاط کے اصلی مرض کا کامل علاج نہیں سمجھتا بلکہ ان میں سے اکثر اس طرح کا علاج ہیں جن کے اندر خود نئی بیماریوں کے پیدا کرنے کی ہلاکت موجود ہے۔ پس وہ ان تمام راستوں سے بالکل الگ ہو گیا جو کار دیار اصلاح و ترقی کے پیشتر سے موجود تھے۔ اور پھر نہ تو اس نے تعلیم کو اپنا کعبہ مقصود بنایا، نہ سیاست کو قبلہ آمال، نہ علم کی رہنمائی قبول کی نہ تہذیب و تمدن سے دستگیری چاہی، صرف یہی ایک صدا بلند کی کہ

یاایھا الذین آمنوا اطیعوا اللہ ورسولہ ولا تولوا عنہ وانتم تسمعون (۸: ۲۱) (مسلمانو! اللہ کی اطاعت کرو اور اس کے رسولؐ کے لائے ہوئے حکم پر عمل کرو اور اس کی طرف سے منہ نہ موڑو اور تم اس کی بھیجی ہوئی آیتیں سن رہے ہو۔)

کیونکہ اس کو یقین ہو گیا کہ جب تک مسلمانوں کے اعتقادات و اعمال مذہبی کی اصلاح و درستگی نہ ہوگی اس وقت تک کوئی سعیٔ اصلاح مفید نہیں ہو سکتی۔

۱؎ محمد علی، مولانا ابوالکلام آزاد سے میری رقابت (اداریہ) ہمدرد دہلی ۲۶ر دسمبر ۱۹۲۶ء ص ۳

۲؎ علامہ اقبال مرحوم نے الہلال کے دس خریدار فراہم کیے تھے۔ الہلال کلکتہ ۹ر اکتوبر ۱۹۱۲ء جلد ۱ نمبر ۱۳ ص ۱

"پس اس نے اپنے مقصد کو ایک ہی مختصر جملے میں بار بار دہرایا، یعنی "دعوۃ الی القرآن" یا "امر بالمعروف ونہی عن المنکر" اور پھر اعمال قومی کی ہر شاخ میں اسی اصل الاصول کو پیش نظر رکھ کر دعوت شروع کی" [۱]

مقصد کے اس اصل الاصول کی وضاحت کے بعد موزونہ حالات پر اس کی تطبیق بھی چند دفعات میں کر دی ہے۔ پہلی دو دفعات کا تعلق خاص تعلیمات الٰہی کے علم و عمل اور خدائے واحد سے اپنے رشتۂ عبودیت کی استواری سے ہے۔ مولانا لکھتے ہیں:

"(۱) مسلمانوں کو چاہیئے کہ اپنے تمام کاموں کی بنیاد تعلیم الٰہی پر رکھیں نہ کہ محض کسی ترقی یافتہ قوم کی تقلید و اتباع کی نقالی پر یا محض اخذ و تحصیل تمدن و سیاست و وطنیت پر۔

(۲) اسلام کی اصل عزیمت و فضیلت یہ ہے کہ اس نے ہر طرح کی صداقتوں اور حقیقتوں کو خدا کے رشتہ سے منسلک کر دیا ہے اور ہر عمل صحیح و حق جو اس آسمان کے نیچے کیا جائے اس کے نزدیک خدا کا کام اور اس کی عبادت ہے۔ پس ہر مسلمان کو صداقت کا عاشق، حقانیت کے لیے مضطر، عدالت کا نگراں اور حریت کا پرستار ہونا چاہیے کیونکہ وہ مسلمان ہے اور مسلمان وہی ہے جو اللہ کی رضا کے لیے ہر طرح کا دکھ اٹھائے اور اللہ کی رضا اس کی راست بازی اور حق و عدل کی معیت میں ہے" [۲]

اسی مقالے میں آگے چل کر دعاۃ اصلاح کی وضاحت کے بعد "دعوت الہلال" کا تعارف کراتے ہیں اور اسے مذہب اصلاح میں "اصلاح دینی و اسلامی" کا نام دیتے ہیں اور اس کے مبادی و مقدمات کے ذیل میں لکھتے ہیں:

ا۔ اسلام کے نظم شریعت میں دین و دنیا کی تقسیم نہیں ہے۔ اسلام نے شریعت الٰہی کو نوع انسانی کی تمام سعادت و ہدایت کا سرچشمہ قرار دیا ہے اور مسلمانوں کی سیاسی، علمی، اخلاقی، قومی، مدنی زندگی کی بنیاد صرف ایک ہی حقیقت جامعہ پر ہے

---

[۱] دعوت الی الحق و داعی الی الحق موعظۃ و ذکری (مقالہ افتتاحیہ) الہلال کلکتہ ۴ فروری ۱۹۱۲ء، ص ۶

[۲] ایضاً

"یعنی شریعت اسلامیہ اور کتاب وسنت پر۔

۲۔ مسلمانوں کی قومیت صادقہ کی بنیاد صرف شریعت، کا علم وعمل ہے۔ شریعت نے ان کو بتلایا تھا کہ دنیا میں سب سے بڑی قوم وہی ہیں، وہی خیر الامم ہیں، وہی شہداء علی الناس ہیں، وہی شہداء اللہ فی الارض ہیں۔ ان کے عروج وسعادت کی علت صرف یہ تھی کہ قرآن حکیم و سنتِ رسولؐ کو انھوں نے اپنا دستور العمل حیات قرار دیا تھا۔ قرآن کی نسبت جو صاحب قرآن کا اعلان تھا۔ اِنّ اللہ یرفع بہٰذا الکتاب قوماً ویضع بہ آخرین (رواہ مسلم) اللہ تعالیٰ اس کتاب کی ہدایت سے قوموں کو اُٹھائے گا اور یہی ہے جس کو ترک کر کے قومیں گریں گی اور ہلاک ہوں گی۔

پس جب مسلمانوں نے قرآن وسنت کا علم وعمل ترک کر دیا تو اقبال وعروج نے بھی ان سے کنارہ کشی کر لی۔ یہ مسلّم اور حقائق تاریخیہ میں سے ہے کہ مسلمانوں کے عروج واقبال کا سب سے بہتر اور ارفع زمانہ وہی تھا جب بجز کتاب وسنت کے علم وعمل کے اور کوئی تعلیم ان کی رہنما نہ تھی یعنی عہد صحابۂ کرام وخلفاء راشدین اور تنزل وفساد کا عہد اس وقت سے شروع ہوا کہ جب اقوام ماضیہ مغضوبہ کے علوم واعمال بدعیہ ان میں رائج ہوئے۔ ایک ہی علت کے دو مختلف نتائج نہیں نکل سکتے۔ پس اگر اب بھی مسلمان اپنے عروج رفتہ کو دوبارہ حاصل کر سکتے ہیں تو صرف ایک ہی راہ ہے۔ اس کے علاوہ جس قدر بھی راہیں نکلیں گی گمراہی وفساد کی ہوں گی۔

۳۔ اس مسلک کی بنیاد اس ایمانی اور اعتقادی حقیقت پر تھی کہ شریعتِ اسلامیہ آخری و اکمل شریعت ہے۔ اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی۔ اور اس کا وعدہ ہے لیظہرہ علی الدین کلہ۔ یقیناً اس وعدے کا ابھی ظہور نہیں ہوا پس ضروری ہے کہ وعدہ الٰہی ظاہر ہو اور اس لیے مستقبل کے لیے اگر کوئی راہ فوز وفتح ہو سکتی ہے تو صرف دعوت شریعت احیاء عمل بالقرآن ہی ہے۔[1]

الہلال کی دعوت اصلاح دینی اسلامی کے مبادیات چہارگانہ میں مقدمہ رابع ہیں علمائے

---

[1] آزاد، مولانا ابوالکلام، خطبۂ صدارت تحریری، جمیعت علمائے ہند لاہور ۱۹۲۱ء، ص ۲۵ تا ۲۷

اسلام کی غفلت و اعراض کا ذکر ہے اور چونکہ نہ صرف دینی، اسلامی اصلاح میں بلکہ علم و عمل اور اصلاح سیاست و معاشرت کی ہر دعوت میں علماء وقت کے احساس و فکر اور بصیرت کی کارفرمائیاں ہمیشہ بہت اہم رہی ہیں اس لیے اس کا مطالعہ بھی افادیت سے خالی نہیں ہوسکتا۔ مولانا لکھتے ہیں:

(۴) مسلمانوں سے استناد و اتباع شریعت مہجور نہیں ہوا۔ مگر علمائے اسلام کی غفلت و اعراض سے شریعت کے علم و عمل کے وہی حامل و مبلغ تھے اور امت کی حیات شرعیہ کا تمام دار و مدار خود ان کی حیات ملی پر تھا جب قرآن و سنت کا ترک وہجر تفرقہ و تشتّت و سبل متفرقہ کا شیوع، اختلاف و تحزب کی عصبیت، علوم محدثہ کا استغراق، حب جاہ و ریاست کا استیلاء، فریضۂ دعوت الی الخیر اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر سے تن آسانی، اہوا سلاطین و امراء کا اتباع، اجتہاد فکر و نظر کا فقدان، تعرض کہ منصب نیابت نبوت کا ضیاع اور اجبار و رہبان من کتاب کے متذکرہ قرآنی مفاسد کا ظہور و احاطہ خود طبقہ علماء میں بحد کمال کو پہنچ گیا تو اس کا لازمی نتیجہ اُمت کی ہلاکت تھا اور وہ ظہور میں آیا۔ وکان وعد اللہ مفعولاً

پس اگر اصلاح حال کی کوئی راہ ہے تو وہ صرف یہی ہے کہ علمائے اُمت کے طبقہ میں احساس حال کی تبدیلی پیدا ہو اور وہ اپنے منصب عظیم کو از سرِ نو سنبھال لینے کے لیے آمادہ ہوجائیں۔ اس طرح علم و عمل شریعت کا احیاء صورت پذیر ہوگا۔[1]

اور پھر وقت و حالات کے تذکرہ اور دعوت کے اصول و مبادی کی تشریح اور الہلال کی دعوتِ اصلاح دینی و اسلامی کے تعارف کے بعد مولانا نے دعوت الہلال کے "مقصد اصلی" کو ان چند جملوں میں سمیٹ دیا ہے۔

"پس الہلال کا مقصد اصلی اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ "مسلمانوں کو ان کے تمام اعمال و معتقدات میں صرف کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ پر عمل کرنے کی دعوت دیتا ہے اور خواہ تعلیمی مسائل ہوں، خواہ تمدنی یا سیاسی ہوں، خواہ اور کچھ وہ ہر جگہ مسلمانوں کو صرف

---

[1] خطبۂ صدارت تحریری، محولہ بالا، ص ۲۷

مسلمان دیکھنا چاہتا ہے"[1]

آخر میں دعوت الہلال کے نتیجے کی طرف توجہ دلاتے ہیں کہ اگر مسلمان زندگی حاصل کر سکتے ہیں تو مسلمان بن کر، ہندو یا مسیحی بن کر نہیں، پھر سوال کرتے ہیں:

"آپ کے ہاں اگر شمع کافوری جل رہی ہے تو آپ کو کسی فقیر کے جھونپڑے سے اس کا ٹمٹماتا ہوا دیا چرانے کی کیا ضرورت ہے"[2]

یہ کافوری شمع وہی کتاب الہٰی ہے جسے خود لسان وحی و ہدایت میں "نور و کتاب مبین" کہا گیا ہے اور یہی وہ نسخۂ کیمیا ہے جو مسلمانوں کے تمام دکھوں کا مداوا اور تمام امراض قومی و ملی کا علاج ہے۔ تشریح و بیان کے لیے مولانا ہی کے الفاظ مستعار لیجیے۔ مولانا لکھتے ہیں:

"جس نے خدا کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا وہ پھر کسی انسانی دستگیری کا محتاج نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے ہر جگہ اپنے تئیں امام مبین، حق الیقین، نور و کتاب مبین تبیاناً لکل شئ بصائر للناس، ہادی و اہدی الی السبیل، جامع احزاب و اشتال، بلاغ للناس، ہادی بحر و بر اور اسی طرح کے ناموں سے یاد کیا ہے۔ اکثر موقعوں پر کہا کہ ہے کہ وہ ایک روشنی ہے جب نکلتی ہے تو ہر طرح کی تاریکی دور ہو جاتی ہے۔ خواہ مذہبی گمراہیوں کی ہو خواہ سیاسی۔

قَدْ جَاءَكُم مِّنَ اللَّهِ نُورٌ وَكِتَابٌ مُّبِينٌ . يَهْدِي بِهِ اللَّهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهُ سُبُلَ السَّلَامِ وَيُخْرِجُهُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ بِإِذْنِهِ وَيَهْدِيهِمْ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ (۵: ۱۵)

(ترجمہ) بیشک تمہارے پاس اللہ کی طرف سے روشنی اور ہر بات کو بیان کرنے والی کتاب آئی۔ اللہ اس کے ذریعے سے سلامتی کے راستوں پر ہدایت کرتا ہے۔ اس کو جو اس کی رضا چاہتا ہے اور اس کو ہر طرح کی گمراہی کی تاریکی سے نکال کر ہدایت کی روشنی میں لاتا اور صراط

---

[1] الہلال کے مقاصد اور پولیٹیکل تعلیم الہلال ۸ ستمبر ۱۹۱۲ء ص ۶

[2] القسطاس المستقیم یعنی مسلمانوں کی آئندہ شاہراہ مقصود کیا ہونی چاہیے۔ الہلال ۹ اکتوبر ۱۹۱۲ء ص

مستقیم پر چلاتا ہے"

اس آیت میں قرآن کو سبل السلام کے لیے ہادی بتلایا ہے کہ وہ تمام سلامتی کی راہوں کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور اگر آپ کے سامنے پولیٹکل اعمال کی بھی کوئی راہ ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کی سلامتی آپ کو قرآن پاک سے نہ ملے۔ پھر کہا کہ وہ انسان کو تمام گمراہیوں کی تاریکی سے نکال کر ہدایت کی روشنی میں لاتی ہے اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہماری پولیٹکل گمراہیاں صرف اس لیے ہیں کہ ہم نے قرآن کے دست رہنما کو اپنا ہاتھ سپرد نہیں کیا۔ ورنہ تاریکی کی جگہ آج ہمارے چاروں طرف روشنی ہوتی۔ آخر میں کہہ دیا کہ وہ صراط مستقیم پر لے جانے والی ہے اور "صراط مستقیم" کی اصطلاح قرآن کی زبان میں ایسی جامع اور مانع ہے کہ ساری دنیا اس کے اندر سمجھیے۔[۱]

مولانا کے الفاظ میں یہی شعلہ فشاں آتش کدہ ہے جسے ایک بار اگر گرم کر لیا جائے تو ہزاروں انسانوں کے سینوں کی انگیٹھیاں دہکائی جا سکتی ہیں پھر جن کی گرمی اور حرارت سے کائنات انسانی کا ہر گوشہ زندگی سے معمور اور سرگرم ہو جائے گا۔ پس مولانا کے الفاظ میں مسلمانوں کا کام صرف یہ ہے کہ اتباع کلمات اللہ وجمیع ما جاء بہ القرآن کے لیے تیار ہو جائیں اور اپنے تئیں تمام انسانی تعلیموں اور اقوام کی کے اتباع و محاکات کے ولولوں سے خالی کر کے صرف ایک ہی معلم کی تعلیم پر چھوڑ دیں۔[۲]

قرآن حکیم کی تعلیمات کے بارے میں مولانا آزاد نے اپنے اعتقاد کا صاف صاف الفاظ میں یہ اعلان کر دیا ہے:

"قرآن کریم صرف نماز اور وضو کے فرائض بتلانے ہی کے لیے نازل نہیں ہوا بلکہ وہ انسانوں کے لیے کامل و اکمل قانون فلاح ہے جس سے انسانی زندگی کی کوئی شے باہر نہیں۔ پس مسلمانوں کی ہر وہ پالیسی اور ہر وہ عمل جو قرآنی تعلیم پر مبنی نہ ہو گا ان کے لیے کبھی موجب فوز و فلاح نہ ہو گا"[۳]

---

[۱] الہلال کے مقاصد اور پولیٹکل تعلیم۔ الہلال ۸ ستمبر ۱۹۱۲ء ص ۵ [۲] القسطاس المستقیم۔ الہلال ۱۶ اکتوبر ۱۹۱۲ء ص ۷ [۳] ایضاً ۲۲ اکتوبر ۱۹۱۲ء ص ۷

اس لیے مولانا آزاد کے نزدیک مسلمانوں کی مذہبی و اسلامی اصلاح کے لیے سب سے پہلی چیز یہ تھی کہ وقت کی ضروریات کے مطابق قرآن کی تعلیم و اشاعت کا سروسامان کیا جائے اور جب تک یہ ضروری سروسامان نہ کر دیا جائے مسلمانوں کی اصلاح و ترقی کی راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ دور نہیں ہو سکتی۔ مولانا کے نزدیک کتاب الہی کا علم و عمل ہی مسلمانوں کو ان کی زندگی کی مصیبتوں سے نکالنے اور انہیں جماعتی زندگی کے برکات و نعائم سے ہم کنار کرنے اور ان کے قیام و بقا کا ضامن ہے۔ ان کے اس عقیدے کا اظہار اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ انھوں نے ترجمان القرآن کے سرورق کی پیشانی کو مسلم کی اس حدیث سے سجایا تھا جو حضرت نافع سے مروی ہے۔ إن الله يرفع بهذا الكتاب اقواماً ويضعُ به آخرين۔ اللہ تعالیٰ اس کتاب کے علم و عمل کے ذریعہ قوموں کو اٹھائے اور انھیں بلند کرے گا اور یہی وہ کتاب ہے جس کے ترک و اعراض کی بدولت کسی کو ہلاکت میں ڈالے گا اور وہ تباہ و برباد ہو جائے گی۔"

ترجمان القرآن

یعنی قرآن حکیم کا اردو ترجمہ ' از خامہ ایڈیٹر الہلال

آسمانی صحائف و اسفار کے حقیقی حامل و مبلغ حضرات انبیاء کرام و رسل عظام ھیں - پس انکی تبلیغ و تعلیم اور نشر و توزیع کا مقدس کام دراصل ایک پیغمبرانہ عمل ھے ' جس کی توفیق صرف انھی لوگوں کو مل سکتی ھے جنھیں حق تعالی انبیاء کرام کی معیت و تبعیت کا درجہ عطا فرماتا ھے ' اور انکا نور علم براہ راست مشکواۃ نبوت سے ماخوذ ھوتا ھے : و ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء -

ھندوستان کی گذشتہ قرن اخیرہ میں سب سے پہلے جس مقدس خاندان کو اس خدمت کی توفیق ملی ' وہ حضرت شاہ عبد الرحیم رحمۃ اللہ علیہ کا خاندان تھا - انکے فرزند حجۃ الاسلام ' امام الاعلام ' مجدد العصر ' حضرۃ شاہ ولی اللہ قدس سرہ تھے ' جنھوں نے سب سے پہلے قرآن حکیم کے ترجمہ کی ضرورت الہام الہی سے محسوس کی ' اور فارسی میں اپنا عدیم النظیر ترجمہ مرتب کیا - انکے بعد حضرۃ شاہ رفیع الدین اور شاہ عبد القادر رحمۃ اللہ علیھما کا ظہور ھوا ' اور اردو زبان میں ترجمۃ القرآن کی بنیاد استوار ھوئی - شکر اللہ سعیھم ' و جعل الجنۃ مثواھم !

اس واقعہ پر ٹھیک ایک صدی گذر چکی ھے ' لیکن یہ کہنا کسی طرح مبالغہ آمیز نہ سمجھا جائیگا کہ نشر و تبلیغ قرآن حکیم کی جو بنیاد اس خاندان بزرگ نے رکھی تھی ' اسکی تکمیل کا شرف حق تعالی نے ایڈیٹر الہلال کیلیے مخصوص کردیا تھا ' جنھوں نے بعض داعیان حق و علم کے اصرار سے اپنے انداز ممتاز ' و بلاغت و انشاء مخصوص ' و فہم حقائق و معارف قرانیہ ' و ضروریات و احتیاجات وقت کو ملحوظ رکھکر قرآن حکیم کا یہ اردو ترجمہ نہایت سلیس ' عام فہم ' معنی خیز ' حقیقت فرما عبارت میں مرتب کیا ھے ' او ر بحمد اللہ کہ زیر طبع ھے -

یہ ترجمہ کیسا ھے ؟ ان لوگوں کیلیے جو الہلال کا مطالعہ کرچکے ھیں ' اسکا جواب دینا بالکل غیر ضروری ھے -

یہ ترجمہ حامل المتن ٹائپ کی جگہہ لیتھو میں چھاپا جارھا ھے تاکہ ارزاں ھو ' اور بچوں ' عورتوں ' سب کے مطالعہ میں آسکے - قیمت فی جلد چھہ روپیہ رکھی گئی ھے - لیکن جو حضرات اس اعلان کو دیکھتے ھی قیمت بھیجدینگے ' انسے صرف ساڑھے چار روپیہ لیے جائینگے - درخواستیں اور روپیہ مہتمم البلاغ کے نام بھیجنا چاھیے -

---

نوٹ — ذیل نمبر دورے کی وجہ سے قیمت فی پرچہ چھہ آنہ

البیان

فی

مقاصد القرآن

ھـذا بیـان للـنـاس ، و ھـدی و موعظۃ للمتقین (۳ : ۳۳)

یعنی قرآن حکیم کی مفصل تفسیر ، از خامۂ اڈیٹر الہلال

اس تفسیر کے متعلق صرف اسقدر ظاہر کردینا کافی ہے کہ قرآن حکیم کے حقائق و معارف اور اسکی محیط الکل معلمانہ دعوۃ کا موجودہ دور جس قلم کے فیضان سے پیدا ہوا ہے ، یہ اسی قلم سے نکلی ہوئی مفصل اور مکمل تفسیر القرآن ہے ا

یہ تفسیر موزون کتابی تقطیع پر چھپنا شروع ہوگئی ہے - ہر مہینے کے وسط میں اسکے کم سے کم ۶۴ اور زیادہ سے زیادہ ۱۰۰ صفحے اعلیٰ درجہ کے ساز و سامان طباعۃ کے ساتھہ شائع ہوتے رہینگے - اس سلسلے کا پہلا نمبر جسمیں نصف حصہ مقدمۂ تفسیر اور نصف سورۂ فاتحہ کی تفسیر کا ہوگا ، انشاء اللہ عنقریب شائع ہوجائیگا سالانہ قبل از اشاعت چار روپیہ - بعد کو پانچ - روپیہ -

هذا بصائر للناس ، و هدى و رحمة لقوم يوقنون !

(۴۵ : ۱۹)

البصائر

ایک ماهوار دینی و علمی مجله

جس کا

اعلان پہلے " البیان " کے نام سے کیا گیا تھا -

وسط شوال سے شائع هونا شروع هوجائیگا

ضخامت کم از کم ۶۴ صفحه - قیمت سالانه چار روپیه مع محصول -

خریداران الہلال سے : ۳ - روپیه

اسکا اصلی موضوع یه هوگا که قرآن حکیم اور اس کے متعلق تمام علوم و معارف پر تحقیقات کا ایک نیا ذخیره فراهم کرے - اور ان موانع و مشکلات کو دور کرنے کی کوشش کرے ' جن کی وجه سے موجوده طبقه روز بروز تعلیمات قرآنیه سے نا آشنا هوتا جاتا هے -

اسی کے ذیل میں علوم اسلامیه و احیاء ' تاریخ نبوۃ و صحابۃ و تابعین کی ترویج ' آثار سلف کی تدوین ' اور اردو زبان میں علوم مفیدۂ حدیثه کے تراجم ' اور جرائد و مجلات یورپ و مصر پر نقد و اقتباس بھی هوگا - تا هم یه امور ضمنی هونگے ' اور اصل سعی یه هوگی که رسالے کے هر باب میں قرآن حکیم کے علوم و معارف کا ذخیره فراهم کرے - مثلاً تفسیر کے باب میں تفسیر هوگی ' حدیث کے باب میں احادیث متعلق تفسیر پر بحث کی جائیگی - آثار صحابه کے تحت میں تفسیر صحابه کی تعیین ' تراجم کے ذیل میں قرآن کریم کی تنزیل و ترتیب و اشاعت کی تاریخ ' علوم کے نیچے علوم قرآنیه کے مباحث اور اسی طرح دیگر ابواب میں بھی یه موضوع وحید پیش نظر رهیگا -

اس سے مقصود یہ ہے کہ مسلمانوں کے سامنے بدفعۂ واحد قرآن کریم کو مختلف اشکال و مباحث میں اس طرح پیش کیا جائے کہ عظمت کلام الہی کا وہ اندازہ کر سکیں - و ما توفیقي الا باللہ - علیه توکلت والیه انیب ؛

القسم العربی

یعنے "البصائر" کا عربی ایڈیشن

جو

وسط شوال سے شائع ہونا شروع ہو جائیگا۔

اور

جس کا مقصد وحید جامعۂ اسلامیہ ' احیاء لغۃ اسلامیہ ' اور ممالک اسلامیہ کے لیے مسلمانان ہند کے جذبات و خیالات کی ترجمانی ہے -

الہلال کی تقطیع اور ضخامت

قیمت سالانہ مع محصول ہندوستان کے لیے : ۲ - روپیہ ۸ - آنہ

ممالک غیر : ۵ - شلنگ -

درخواستیں اس پتہ سے آئیں :

نمبر (۱۴) - مکلوڈ اسٹریٹ - کلکتہ

هذا بیان للناس ، و هدی و موعظة للمتقین

(۳ : ۱۳۲)

البیان

— • —

دفتر الہلال کا ماہوار رسالہ

جسکا اصلی موضوع یہ ہوگا کہ قرآن کریم اور اسکے متعلق تمام علوم و معارف پر
تحقیقات کا ایک نیا ذخیرہ فراہم کرے ' اور ان موانع و مشکلات کو دور کرنے کی
کوشش کرے ' جنکی وجہ سے موجودہ طبقہ روز بروز قرآن کریم کی تعلیمات سے
نا اشنا ہوتا جاتا ہے لیکن ساتھہ ہی تقریباً آٹھہ ابواب اور بھی ہونگے جنکے
نیچے مختلف موضوع و بحث کے علمی و مذہبی مضامین شائع کیے
جائیں گے - ضخامت ' وضع و قطع ' اور حسن طبع و حروف کی
نسبت اسقدر کہدینا کافی ہے کہ انشاء اللہ الہلال کی طرح
وہ بھی اردو پریس میں پہلا ماہوار میگزین ہوگا
و ما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت

والسیہ انیہ

بہ حیثیت محدّث

لکھنے والے:

مولانا غلام رسول مہر
مولانا محمد شعیب عمری

مولانا غلام رسول مہر

مولانا ابو الکلام آزاد کا تصورِ حدیث اور ان کی خدمات

بیاورید گرایں جا بود زباں دانے
غریبِ شہر سخنہائے گفتنی دارد

"الرحیم" کی اشاعت اکتوبر ۱۹۶۶ء میں ایک تحریر شائع ہوئی ہے، جس میں ابو سلمان صاحب شاہ جہان پوری کے ایک مقالے[1] پر تبصرہ فرماتے ہوئے ایک بزرگوار نے مولانا ابو الکلام آزاد مرحوم و مغفور کو ہدف بنا لیا۔ وہ مقالہ مولانا مرحوم کا نہ تھا کہ مذکورہ بالا تقریب کے لیے کوئی بعید سی وجہ جواز بھی ذہن میں آسکتی۔ یقیناً اس میں "ترجمان القرآن" جلد دوم سے بعض اقتباسات لیے گئے تھے، لیکن نہیں کہا جاسکتا کہ ان اقتباسات کے نظم و ترتیب یا ان سے اخذ نتائج یا طریقِ استدلال کو مولانا آزاد رح کی ذاتِ گرامی سے کوئی بعید سا بھی تعلق تھا۔ سمجھ میں نہ آیا کہ انہیں زیرِ انتقاد لانے کے لیے اک گونہ اضطراب و بے تابی کا حقیقی سبب کیا ہوا؟

ذمہ داری کا تقاضا :-

جس کتاب سے یہ اقتباسات لیے گئے تھے وہ تیس سال سے چھپی ہوئی موجود ہے۔ اس کے کئی اڈیشن (مستند و غیر مستند) چھپ چکے ہیں اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس تک

ماخذ: ماہنامہ الرحیم حیدرآباد (سندھ) بابت مارچ ۱۹۶۷ء

[1] میرا مقالہ "صحتِ حدیث کی قطعیت ـــ مولانا آزاد کی نظر میں" کے عنوان سے جون ۱۹۶۶ء میں شائع ہوا تھا۔ ایک صاحب کو کوئی بات پسند نہ آئی، انہوں نے ایک سخت مراسلہ لکھ ڈالا۔ مولانا غلام رسول مہر مرحوم نے اس سے متاثر ہو کر یہ مقالہ تحریر فرمایا۔ کیسی محبت والے بزرگ تھے، کتنا اچھا اسلوب تعلیم تھا۔ اندازِ نگارش کی دل آویزی کے ساتھ مضمون کی معنی آفرینی، مولانا آزاد رح کی خدمتِ حدیث کی طرف فکر انگیز اشارات اور محکم طریقِ دفاع۔ کون سی خوبی ہے جو اس میں موجود نہیں۔ میرے مطالعہ و تحریر کا بالکل ابتدائی دور تھا۔ مولانا مہر صاحب کی شفقت اور تحریر کی حلاوت کو قلب آج تک محسوس کرتا ہے۔ (شاہجہانپوری)

دسترس مشکل تھی۔ اگر صاحبِ تحریر جنہوں نے "الرحیم" کی مقصدیت کے لیے خاص تڑپ کا اظہار فرمایا، گراں بہا ذمہ داری کا احساس رکھتے اور اصل کتاب دیکھ لیتے تو انہیں یہ اندازہ کرنے کا یقیناً بہتر موقع مل جاتا کہ آیا وہ مفہوم واقعی درست و محکم ہے جو زیرِ نظر مقالے کے سرسری مطالعے سے مولانائے مرحوم کے نقطہ نگاہ کے متعلق انہوں نے سمجھا؟ اہل تحقیق کا شیوہ یہ نہیں ہوتا کہ کوئی چیز سرسری طور پر دیکھیں پھر جو فرد آپ کے سامنے آجائے اس پر تعریض کی بجلیاں گرانے میں مصروف ہو جائیں۔

تین کتابیں :۔

مولانا ابو الکلام ؒ نے ۱۹۱۵ء میں فیصلہ کیا تھا کہ قرآن مجید کے فہم و مطالعہ کے سلسلے میں تین مختلف ضرورتوں کے لیے تین چیزیں مرتب کر دی جائیں۔ جیسا کہ انہوں نے خود "ترجمان" کی جلد اول کے آغاز میں اختصاراً فرمایا تھا یعنی،

۱۔ عام تعلیم کے لیے ترجمہ، جسے انہوں نے "ترجمان القرآن" سے موسوم فرمایا۔

۲۔ مطالعے کے لیے تفسیر، جس کا صرف ایک نمونہ بہ سلسلہ تفسیر فاتحہ "ترجمان" جلد اول کے ساتھ شائع ہوا یا قرآن مجید کے سلسلے میں بعض تاریخی مباحث کا ایک ٹکڑا جلد دوم میں سورہ کہف کے ساتھ شامل کیا۔

۳۔ اہل علم و نظر کے لیے مقدمہ، جس کا صرف ایک نامکمل فرمہ اب "ام القرآن" کے ساتھ چھپا ہے۔ مولانا نے کئی مرتبہ فرمایا کہ مقدمے میں قرآن مجید کے تمام بنیادی مطالب چوبیس عنوانوں کے تحت مرتب کر دیے گئے ہیں۔ اس کتاب کے مطالعے کے بعد قرآن مجید کے متعلق ان شاء اللہ کوئی ضروری مسئلہ باقی نہ رہ جائے گا۔

ترجمان کا دائرہ بحث

غرض "ترجمان" صرف عام تعلیم کے لیے تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ مطالبِ قرآنی کے فہم و تدبر کے لیے ایک ایسی کتاب تیار ہو جائے، جس میں کتب تفسیر کی تفصیلات تو نہ ہوں، مگر وہ سب کچھ ہو، جو قرآن کو ٹھیک ٹھیک سمجھ لینے کے لیے ضروری ہے۔ ترجمے کے ساتھ نوٹ اس غرض سے شامل کیے گئے کہ متعلقہ آیات کے متعلق مختصر الفاظ میں مطالب و معارف کا مزید ذخیرہ مہیا ہو جائے۔ یہ نوٹ تشریح و وضاحت کا ایک مزید

درجہ ہیں۔ ورنہ قرآن کا مطلب صاف سمجھ لینے کے لیے اصل ترجمہ کفایت کرتا ہے۔ عموماً اس سے زیادہ طلب و ضرورت بھی نہیں ہوتی۔

یہ تفصیل "ترجمان القرآن" کا دائرہ تحریر و بحث واضح کرنے کی غرض سے عرض کرنی پڑی۔ یہ کتاب قرآن مجید کی تفسیر نہ تھی کہ اس میں ہر مسئلے کے ایک ایک پہلو پر سیر حاصل بحثیں کی جاتیں۔ البتہ اہل شوق کا اصرار بڑھ گیا تو دوسری جلد میں مولاناؒ نے بعض اہم مطالب کی مزید توضیح و تفہیم کے لیے مختلف سورتوں کے آخر میں کچھ مباحث دیئے، لیکن کتاب کا عام دائرہ بحث وہی رہا، جو ابتدا میں مقرر کر لیا گیا تھا اور اسے تفسیر کا درجہ حاصل نہ ہُوا۔

اِبتلاء کی بجلیاں :۔

نومبر ۱۹۱۵ء میں مولاناؒ نے ایک طرف "البلاغ" جاری کیا۔ ساتھ ہی "ترجمان القرآن" لیتھو میں اور "البیان" ٹائپ میں چھپوانے کا انتظام کر لیا۔ ساتھ ساتھ مقدمہ بھی ٹائپ میں چھپنے لگا۔ اچانک مارچ ۱۹۱۶ء میں انہیں بنگال سے اخراج کا حکم ہو گیا اور وہ رانچی (صوبہ بہار) چلے گئے۔ خیال تھا کہ "البلاغ" بھی جاری رکھیں گے اور "ترجمان و البیان" کی اشاعت میں بھی خلل نہ پڑے گا۔ مقدمہ "البیان" کے ساتھ ساتھ چھپتا جائے گا، مگر البلاغ بند ہو گیا پھر پے در پے تلاشیاں ہوئیں، تین مرتبہ کلکتہ میں اور دو مرتبہ رانچی میں۔ ان میں تمام مسودے، کتابت شدہ یا مطبوعہ فرمے، یادداشتوں اور نوٹوں کے بیش بہا ذخیرے پولیس نے اُٹھوا لیے۔ سالہا سال کے بعد ان کا جو حصہ واپس ملا وہ اس قابل نہیں رہا تھا کہ اس سے کوئی کام لیا جا سکتا۔

مقدمے کی طباعت کی تصدیق یوں ہوئی کہ اب اس کا ایک نامکمل اور خستہ فرمہ ملا جسے "ام القرآن" کے ساتھ چھاپا گیا۔ اس کے آغاز میں مقدمے کے پانچویں باب کا ذکر ہے۔ گویا یہ فرمہ پانچویں باب سے بعد کا ہے۔

ایک آیت کی تشریح :۔

"ترجمان" میں مولانا کی کوشش یہ تھی کہ مفصل بحثیں نہ چھیڑیں، مگر کوئی ضروری معاملہ عام اصحاب کے لیے خلجان کا باعث ہو تو اُسے اختصاراً صاف کر دیں۔ چنانچہ انہوں نے سورۃ انبیاء کے آخری مباحث میں اس معاملے کی بھی تشریح فرمائی، جسے بعض مفسرین نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ منسوب کر کے ایک روایت کی توثیق کا سامان بہم پہنچایا ہے۔

سورۂ انبیاء کی ایک آیت "تَاللّٰهِ لَاَكِيْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ الآیۃ" کو بعض اصحاب نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تین باتوں میں سے ایک قرار دیا تھا جو خلاف واقعہ یا "کذب" تھیں۔ مولانا نے اس آیت کی تشریح فرمائی اس کا موقع اور محل واضح کر دیا، جس کے بعد اسے خلاف واقعہ سمجھنے کے لیے کوئی بھی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ ایسی دوسری بات "قَالَ اِنِّیْ سَقِیْمٌ" قرار دی جاتی ہے جو سورۂ صافات میں ہے۔ مولانا نے فرمایا کہ اس کی تشریح تو سورۂ صافات میں آئے گی۔ تاہم اس کا کوئی بھی مطلب ٹھہرالیا جائے۔ اس سے جھوٹ کا کون سا پہلو نکلتا ہے؟ ایک شخص کہتا ہے کہ میں بیمار ہوں، اسے جھوٹ کیوں سمجھا جائے؟ باقی رہی تیسری بات کہ حضرت نے بعض مصالح کی بنا پر اپنی اہلیہ کو بادشاہ کے روبرو بہن کہا تو مولانا نے فرمایا، یہ بات قرآن میں کہیں نہیں آئی، تورات میں ہے اور تورات کے موجودہ نسخے کی صحت کا ذمہ ہم نہیں اٹھا سکتے۔

غیر معصوم کی شہادت اور یقینیات دین۔

ظاہر ہے کہ مولانا نے "ترجمان" کے دائرہ بحث ونظر کے اندر رہتے ہوئے اصل شئے کو بے بنیاد قرار دیا۔ ان کا اسلوب تحریر ذہنی الجھنوں ہی کا ازالہ نہیں کرتا بلکہ دل میں روح یقین تازہ کر دیتا ہے۔ فرمایا کہ قرآن نے نبی کا جو سب سے بڑا وصف قرار دیا ہے، وہ اس کی سچائی ہے۔ نبوت ایک سیرۃ ہے جو صرف سچائی ہی سے بنتی ہے۔ حقیقت اور سچائی کے خلاف جو کچھ ہے، خواہ وہ کسی شکل اور کسی درجے میں ہو، نبوت کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتا۔

مولانا کو علم تھا کہ صحیحین کی ایک روایت اس اصل سے متعارض بتائی ہے۔ اسی سلسلے میں انہوں نے "صحت" اور "عصمت" کی بحث چھیڑی۔ یعنی یہ کہ روایت کی صحت کا مطلب ہے، ایسی صحت، جیسی اور جس درجے کی صحت ایک غیر معصوم انسان کے اختیارات کی ہو سکتی ہے۔ عصمت کا اعتقاد نہیں۔ غیر معصوم کی شہادت ایک لمحے کے لیے بھی یقینیات دینیہ کے مقابلے میں تسلیم نہیں کی جا سکتی۔ مان لینا پڑے گا کہ یہ اللہ کے رسول کا قول نہیں اور ایسا مان لینے سے نہ تو آسمان پھٹ پڑے گا اور نہ زمین شق ہو جائے گی۔

مولانا آزاد کا موقف

یہ اصل مسئلے کی اصولی حیثیت تھی، لیکن مولانا نے روایت سے قطع نظر نہیں کیا بلکہ فرمایا:۔

۱۔ یہاں ہم نے اصل واضح کر دی، لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ روایتِ مشہورہ کے متن واسناد پر نظر ڈالی جائے، اس کے لیے "البیان" کا انتظار کرنا چاہیے۔

۲۔ قرآن کے بعد دین کی اُن کتابوں میں جو انسانوں نے ترتیب دی ہیں، سب سے زیادہ صحیح کتابیں "جامع بخاری" اور "جامع مسلم" ہیں، ان کی ترجیح محض شروط کی بنا پر نہیں بلکہ شہرت اور قبول کی بناء پر ہے چونکہ یہ دو باتیں (شہرت اور قبول)، تاریخ اسلام میں صرف انہی کتابوں کے حصے میں آئیں ولیس لهما ثالث اس لیے بھی قوی تر سمجھی جاتے گی کہ وہ صحیحین کی روایت ہے۔ دوسرے مجامیع کی روایات کتنی ہی شروط بخاری و مسلم پر نکال کر دکھا دی جائیں لیکن وہ اس قوت کا ہم پلّہ نہیں ہو سکتیں۔

بے تعلق نکتہ آفرینی:۔

غرض صحیحین کا درجہ ترجیح مسلّم، روایت کے متن واسناد پر نظر ڈالنا لازم، پھر معلوم نہیں تبصرہ نگار بزرگ نے ان حقائق کو نظر انداز فرما کر بعض عجیب وغریب نکات کہاں سے پیدا کر لیے اور انہیں اصل بحث سے کیا علاقہ تھا؟ مثلاً:۔

۱۔ صحت حدیث کی قطعیت کا یہ میعار کہ کہیں کسی حدیث یا روایت کا قرآن مجید سے تعارض نہ ہو، خود محدثین کرام رحمۃ اللہ علیہم اجمعین کی حقیقت بیں نگاہوں سے اوجھل نہ تھا۔

۲۔ جب امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ اپنی اپنی صحیح میں اس حدیث کو جو مولانا کے اس تصور حدیث کی بنیاد ہے نقل کر رہے تھے، اس وقت عصمت انبیاء جیسا اہم اور بنیادی مسئلہ ان سے پوشیدہ نہ تھا۔

۳۔ احادیث و روایات کا بیشتر حصہ (کذا فی الاصل) ظاہری اعتبار سے متعارض نظر آتا ہے مگر خود محدثین و فقہاء کرام نے اپنی دقّت نظر اور مزاج شناسی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نکھرے مذاق سے ہمیشہ فن تعبیر سے کام لیا جس سے یہ ظاہری تعارض بھی ختم ہو جاتا ہے۔

۴۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ خود حدیث و روایت ہی کو جو متعارف میعار کے مطابق درست ہو، حرف غلط کی طرح موقوف کر دیا ہو۔

۵۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے "کذب" کی حدیث کو حجت بنا کر تشکیک کی راہ پیدا کرنا کسی طرح بھی ممکن نہیں، حالانکہ خود قرآن مجید میں اس کا قرینہ موجود ہے۔

کوئی کہتا ہے؟

ان ارشاداتِ گرامی کو، جو یقیناً حجیت حدیث سے عشق و محبت کا کرشمہ ہیں، اصل معاملے سے کیا تعلق ہے؟ ایک شخص محض حدیث کی حجیت ہی کو لازم نہیں مانتا۔ یہ اعلان بھی کرتا ہے کہ بخاری و مسلم کو تمام دواوین حدیث پر ترجیح ہے۔ یہ بھی کہتا ہے کہ زیر غور روایت کے متن و اسناد پر نظر ڈالنا ضروری ہے، مگر اسے "البیان" پر موقوف رکھتا ہے کیونکہ "ترجمان" کا دائرہ بحث محدود ہے۔ آخر اسے یہ جتلانے کا کون سا موقع اور محل تھا۔ کہ محدثین کی نظروں سے یہ اوجھل نہ تھا اور بخاری و مسلم کی حقیقت بیں نگاہوں سے یہ پوشیدہ نہ تھا یا ظاہری تعارض کو فن تعبیر سے ختم کر دیا گیا یا حدیث معیارِ متعارف کے مطابق درست تھی اسے حرف غلط کی طرح موقوف کر دیا گیا۔

صاحب تحریر کا معاملہ:۔

سوال یہ ہے کہ مولانا نے کہاں کسی حدیث کو حجت بنا کر تشکیک کی راہ پیدا کی جس کے لیے بقولِ بزرگ محترم قرآن میں قرینہ موجود ہے؟ کیا اس کی وجہ یہ نہیں کہ آپ کی نظر پہلے حدیث پر جاتی ہے اس کے بعد آپ قرآن سے قرینے پیدا کرتے ہیں؟ غالباً اسی وجہ سے مولانا نے پہلے آپ حضرات کے پیدا کردہ "قرینوں" کا صفایا کیا، پھر لکھا کہ اصل روایت کی جانچ پڑتال بھی ضروری ہے۔

غالباً مولانا کو اسی لیے یہ لکھنا پڑا کہ ہر گوشے کی طرح اس گوشے میں بھی متاخرین افراط و تفریط میں پڑ گئے ہیں:۔

> "ایک طرف فقہائے حنفیہ ہیں، جنہوں نے یہ دیکھ کر کہ بخاری و مسلم کی مرویات کی زد ان کے مذہب پر پڑ رہی ہے، اس امر کی کوشش شروع کر دی کہ ان دونوں کتابوں کی صحت کی قوت کسی نہ کسی طرح کمزور کی جائے۔۔۔ حالانکہ صحیحین کی ترجیح محض ان شرائط کی بنا پر نہیں بلکہ شہرت اور قبول کی بنا پر ہے اور اس پر تمام امت کا اتفاق ہو چکا ہے۔ دوسری طرف عام اصحابِ حدیث ہیں، جنہوں نے اس باب میں ٹھیک تقلید کی وہی چادر اوڑھ لی ہے جو فقہائے مقلدین

کے سروں پر انہوں نے دیکھی اور اسے پارہ پارہ کر دینا چاہا تھا۔ ان کے سامنے جونہی بخاری و مسلم کا نام آجاتا ہے، بالکل درماندہ ہو کر رہ جاتے ہیں۔ پھر کوئی دلیل و حجت بھی انہیں اس پر تیار نہیں کر سکتی کہ ان کی کسی روایت کی تضعیف پر اپنے آپ کو راضی کر سکیں۔"

سنگ دلی اور بے انصافی :-

زمانے کی ستم ظریفی نہیں، انتہائی سنگ دلی اور بے انصافی ملاحظہ ہو کہ جس فرد فرید نے سنہ ۱۹۱۲ء سے زندگی کے آخری سانس تک پورے چھیالیس سال حجیت حدیث کے قیام و ثبات میں گزار دیئے اور مسلسل تحریری و تقریری دعوتوں سے حدیث کی اہمیت از سر نو قائم و استوار کر دی اس پر یہ الزام عائد کرتے وقت ایک محب حجیت حدیث کو تامل نہیں ہوتا کہ حدیث میں تشکیک کی راہ پیدا کی جا رہی ہے ؎

او بہ ہلاکِ من خوش است، من بہ بقائے عمرِ او
قاعدۂ وفا نگر، یار چنیں و من چناں

لیکن شکوہ زبان پر نہیں آسکتا۔ راہِ دعوتِ حق کے یہ وہ کانٹے ہیں کہ اگر داعی حق کا دامن ان سے تار تار نہ ہو اور اس کا جسم زخموں سے لالہ زار نہ بن جائے تو سمجھنا چاہیے کہ دعوت کا حق ادا نہیں ہوا ؎

آزار از جراحت بیگانگاں رسد
مرہم منہ کہ زخمِ دل از آشنا رسید

شاید کلیم ہمدانی نے ایسے ہی حالات میں کہا تھا ؎

خارے اگر بہ پائے طلب ناخلیدہ ماند
از سر بگیر راہ بہ پایاں رسیدہ را

خوانندگانِ کرام کے ملاحظے کے لیے ان کوششوں کا سرسری ساذکر غالباً بے محل نہ ہو جو مولانا نے ابتدائے دورِ خدمت سے مقامِ حدیث کی استواری کے لیے فرمائیں۔ جن کے پیشِ نظر کہا جا سکتا ہے :-

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

ایک مثال:۔

۱۹۱۳ء کے اوائل کا واقعہ ہے۔ ربیع الاوّل کا مہینہ قریب تھا۔ کسی صاحب نے سوال کیا کہ میلاد کے سلسلے میں بعض روایتیں بیان کی جاتی ہیں جو بداہتہً غلط معلوم ہوتی ہیں۔ میں نے بطور خود رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے متعلق ایک تحریر مرتب کی ہے، جب وہ چند علمار کی خدمت میں پیش کی گئی تو وہ برہم ہوئے کہ ان میں وہ واقعات موجود نہیں، جو بیان کیے جاتے ہیں" میں نے ایک عالم سے پوچھا کہ آیا وہ صحیح ہیں اور مستند تاریخوں یا احادیث میں ملتے ہیں، تو جواب ملا کہ ملتے نہیں مگر آج کل کے نیچریوں اور لامذہبوں کو ان کے ماننے میں تامل ہے۔

موصوف نے وہ تمام واقعات بھی ایک ایک کر کے لکھ دیے۔ ساتھ ہی لکھا کہ آیا ایسے واقعات عقل میں آتے ہیں؟

مولانا نے "الہلال" میں بیان کردہ واقعات کی حقیقی حیثیت واضح فرمادی اور ان سب کو بے اصل و غلط بتایا، مگر ساتھ ہی لکھا:۔

"روایات کی صحت و عدمِ صحت کی نسبت ضمناً جس خیال کا اظہار آپ نے (مستفسر نے) فرمایا۔ افسوس کہ فقیر اس سے متفق نہیں۔ یہ ایک نہایت خطرناک اصولی غلطی ہے۔ جس میں زمانہ حال کے مدعیانِ تحقیق و اجتہاد اور رہروانِ جادۂ تطبیق عقل و نقل برسوں سے مبتلا ہیں۔ آپ نے بار بار اس سوال کو دہرایا کہ اگر یہ روایات صحیح ہیں تو آیا عقل میں آسکتی ہیں؟ جواباً گزارش ہے کہ روایات تو صحیح نہیں لیکن یہ اصول کب صحیح ہے کہ جو واقعہ عقل میں نہ آئے وہ یکسر غلط اور موضوع ہے"؟

"آپ بلا تامل پوچھیے کہ یہ واقعات اصولِ فنِ روایت کی بنا پر کہاں تک صحیح اور قابلِ قبول ہیں اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ صرف اتنا ہی پوچھ لینا آپ کے مقصد کے لیے کافی ہے، لیکن یہ کہاں کا اصولِ تحقیق اور معیارِ تمیزِ حق و باطل ہے کہ واقعے کی صحت کے لیے پہلی شرط عقل کی تصدیق ہے؟ آپ لوگ بے تکلف یہ جملہ کہہ دیا کرتے ہیں، مگر نہیں سمجھتے کہ یہ کیسی سوفسطائیت کی راہ ہے جو اس طرح آپ کے سامنے کھل جاتی ہے"؟

عقل کوئی معیار نہیں:-

ہر واقعے کی صحت کے لیے پہلی چیز اصولِ روایت اور صحتِ نقل کی شرائط کا اجتماع ہے اور بس، نہ کہ زید و بکر کی عقل میں آنا۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ مارکونی کی ٹیلی گرام (بے تار پیغام رسانی) کو آپ کی عقل تسلیم کرتی ہے لیکن جب اول مرتبہ اس کی ایجاد کی خبر یورپ کے کسی مستند پرچے میں دیکھی ہو گی تو اس کی آپ نے تصدیق کی تھی یا نہیں؟

آپ کو معلوم نہیں، یہی وہ سرحد ہے جہاں (باوجود اتحادِ مقصد و اصول) مجھے آج کل کے مصلحین مذہب سے الگ ہونا پڑتا ہے۔ ان لوگوں کا یہ حال ہے کہ جس حدیث اور جس روایت کو اپنے خود ساختہ معیار عقلی سے ذرا سے الگ پاتے ہیں، معاً اس سے انکار کر دینے کے لیے بے چین ہو جاتے ہیں . . . . حالانکہ اگر انہیں علوم دینیہ کے حصول کا موقع ملا ہوتا اور علم و فن پر نظر ہوتی تو وہ دیکھتے کہ اسی مقصد کو اصولِ فن کے ساتھ چل کر بھی حاصل کر سکتے ہیں کیا ضرورت ہے کہ ان روایات کی تغلیط محض اس وجہ سے کر دی جائے کہ وہ ہماری عقل میں نہیں آتیں؟ جب کہ اصول مقررہ حدیث و آثار، طریق جرح و تعدیل روایت، تحقیق و نقد درایت اور شہادات موثقہ ارباب علم و فن کی بنا پر بغیر کسی دقت کے ثابت کر سکتے ہیں کہ یہ روایات ہی پایۂ اعتبار سے ساقط ہیں اور اصولِ فن کے اعتبار سے لائق احتجاج نہیں اس طرح بغیر سر رشتہ اصول کو ہاتھ سے دیئے اسی منزلِ مقصود تک پہنچ سکتے ہیں۔

مولاناؒ کی خدمت حدیث:-

یہ محض ایک مثال ہے۔ مولاناؒ کی پوری حیات دعوت ایسی مثالوں سے معمور رہی ہے۔ یہاں ایسے بزرگوں کی کمی نہیں جن کی زندگیاں علم حدیث کے پڑھانے میں بسر ہوئیں اور انہوں نے اس وسیع سرزمین میں یہ علم از سر نو زندہ کیا، جو دین کے اہم ماخذ میں سے ہے۔ لیکن نئے تعلیم یافتہ طبقہ میں حدیث کی عظمت و اہمیت پیدا کرنے کا جو اہم کام مولاناؒ نے انجام دیا، اس میں کوئی ان کا شریک و سہیم نہیں "الہلال" و "البلاغ" کی جلدوں میں سیکڑوں مضمون مل جائیں گے، جو احادیث کی شروح کے حامل ہیں اور یہ شروح ایسے دل آویز انداز میں کی گئی ہیں کہ پڑھتے ہی ہر شخص کے دل میں اتر جاتی ہیں۔ لیکن قدر شناسی کی یہ عجائب کاری ملاحظہ ہو کہ اسی شخصیت پر اس سلسلے میں تشکیک کا الزام لگایا جاتا ہے۔ مولاناؒ آج اس دنیا میں موجود نہیں لیکن ہوتے بھی تو اس کے سوا کیا کہتے کہ:

نیشکر آنچناں نخورد کس زدست دوست
کآزادگاں زدست مبارز سناں خورد

اور سب کچھ چھوڑ دیجیے "ترجمان القرآن" ہی کو دیکھ لیجیے۔ مسلسل و متواتر احادیث کے حوالے موجود ہیں، ان سے اپنے پیش کردہ مطالب کی توثیق کی گئی ہے۔ کہیں بخاری کا حوالہ ہے۔ کہیں مسلم کا اور کہیں اصحاب سُنن کا۔ کیا یہ حدیث میں تشکیک کا ثبوت ہے؟ کیا اسے راہِ تشکیک پیدا کرنے سے تعبیر کیا جائے گا؟ حدیث سے عشق و محبت مسلم سہی لیکن اس کا یہ طریقہ نہیں کہ جوشِ غیرت کا سرمایہ اپنوں ہی پر صرف کر دیا جائے اور مولانا محمد علی مرحوم کے ایجاد کردہ محاورے کے مطابق "پورس کے ہاتھی" بن کر اپنی ہی صفوں کو پامال کر ڈالا جائے۔

ایک نہایت عجیب نکتہ :۔

ایک نہایت عجیب نکتہ یہ فرمایا گیا ہے کہ "کذب" کی شرعی اور لغوی حیثیت معلوم کر لی گئی ہوتی۔ اس سے اُمت پر سہولت و یُسر کی کتنی راہیں کھل گئی ہیں۔

سُبحان اللہ! امت مرحوم پر سہولت و یُسر کی راہیں کھولنے کا کتنا عمدہ طریقہ سوچا گیا ہے؟ یعنی پہلے ایک جلیل القدر پیغمبر پر جو سچائی کے مقامِ بلند پر فائز اور معصوم ہے "کذب" کا اثبات کیا جائے، اس کے لیے قرآن مجید میں کوئی وجہ و سبب موجود نہ ہو تو تفسیر بالرائے سے ایسے پہلو پیدا کرنے چاہییں کہ روایت پر زد نہ پڑے۔ پھر "کذب" کی شرعی اور لغوی حیثیت کی توضیح کی جائے اور بتایا جائے کہ یہاں یہ لفظ ان معنی میں استعمال نہیں ہوا جس میں اسے قرآن حکیم نے بے شمار مقامات پر استعمال کیا ہے، حتیٰ کہ لَعۡنَتُ اللّٰہِ عَلَی الۡکٰذِبِیۡنَ بھی موجود ہے۔ بلکہ اس کے خاص اور محدود معنیٰ ہیں۔ اگر خدا کا ایک بندہ کہتا ہے کہ قرآن مجید میں اس اصدق الصادقین کے متعلق کوئی ایسی بات ثابت نہیں، جسے جھوٹ کہا جا سکے تو اس کے متعلق بے تکلف کہہ دیا جائے کہ وہ حدیث کے سلسلے میں راہ تشکیک پیدا کرتا ہے!

رونے سے اے ندیم ملامت نہ کر مجھے
آخر کبھی تو عقدۂ دل وا کرے کوئی

اِحترامِ حدیث کی حیثیت :

پھر میرے محترم بزرگ نے صرف بخاری اور مُسلم کا احترام سیکھا ہے اور احترام بھی ایسا کہ وہ قرآن حکیم کی آیت کو معانی ظاہرہ و باہرہ سے پھرا دینے پر ہمہ تن تیار ہیں، بلکہ اس میں

کسی کو تامل ہو تو اس پر تشکیک کی خدنگ افگنی کے لیے آمادہ ہیں۔ مگر صحیحین کی کسی روایت پر مزید غور و فکر یا تحقیقِ متن و اسناد کی اجازت دینے پر بھی رضامند نہیں۔ کیا انہیں معلوم ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم و مغفور نے ۱۹۱۴ء میں اعلان فرمایا تھا کہ صحیح بخاری اس دنیا کی بہترین کتاب ہے؟ آپ کو یہ حقائق تو یاد نہ رہے، صرف یہ یاد رہ گیا کہ مولانا رح کی ایک تحریر سے حدیث میں تشکیک کا راستہ کھلتا ہے ؎

تمہیں لے دے کے ساری داستان سے یاد ہے اتنا
کہ عالمگیر ہندو کُش تھا، ظالم تھا، ستمگر تھا

تاریخ اسلام کی بہترین کتاب:۔

۱۹۱۴ء میں مولانا شبلی مرحوم و مغفور کی وفات پر کلکتہ میں ایک جلسہ تعزیت ہوا تھا جس میں مولانا آزاد نے "شبلی کی حیاتِ علمی و ادبی" پر ڈیڑھ گھنٹہ تقریر فرمائی تھی، اس میں تدوینِ علوم کا ذکر فرماتے ہوئے یہ بھی کہا تھا کہ متقدمین کی کتابیں متاخرین کے مقابلے میں بہتر ہیں۔ اس ضمن میں فرمایا:۔

"نہ صرف عظمت موضوع و نفس مضمون کے لحاظ سے، بلکہ طرزِ تصنیف و ترتیب، ضبطِ مطالب اور حُسنِ تقسیم و تنظیم کے لحاظ سے بھی تاریخ اسلام میں بہترین کتاب صحیح بخاری لکھی گئی ہے اور کوئی اسلامی تصنیف اس تک نہیں پہنچ سکتی۔ امام بخاری رح کے بعد بقیہ اصحاب صحاح، جامعین و معاجم و مسانید نے نئے نئے اسلوب مطالب پیدا کیے مگر کوئی کتاب صحیح بخاری تک نہ پہنچ سکی اور یہ میں محض حدیث کی قدیم خوش اعتقادی کی بنا پر نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ یقین کیجیے اس فن تصنیف کو پیشِ نظر رکھ کر، جو ترقی یافتہ علمی زبانوں میں آج پایا جاتا میں نے عَلیٰ وَجْہِ الْبَصِیْرَۃ یہ رائے قائم کی ہے۔"

(البلاغ ۱۷/۲۴ دسمبر ۱۹۱۵ء)

یہ اس جلیل القدر ہستی کا اعلان "صحیح بخاری" کے متعلق ہے اور آج کا نہیں باون سال پیشتر کا اعلان ہے اور یہ رائے اس نے ترقی یافتہ علمی زبانوں کے مروجہ فن تصنیف کی بنا پر قائم کی تھی:۔

خیال کن تو کجائی و ما کجا واعظ

حقیقتِ حال:۔

یہ بھی کہہ دوں کہ "تَاللّٰہِ لَاَکِیْدَنَّ اَصْنَامَکُمْ الآیۃ" اور "قَالَ اِنِّیْ سَقِیْمٌ" تو بحمد اللہ ہر شائبہ کذب سے بالکل پاک ہیں، اِلّا یہ کہ قرآن کے الفاظ سے خواہ مخواہ وہ معنی نکالنے کی کوشش کی جائے، جو ان سے نہیں نکلتے۔ لیکن تورات کی جو روایت اس سلسلے میں پیش کی جاتی ہے، وہ بھی بداہتہً ناقابل قبول ہے۔ مولانا نے تو یہ فرما کر معاملہ ختم کر دیا تھا کہ تورات کے موجودہ نسخے کی صحت کا ذمہ ہم نہیں اٹھا سکتے۔ لیکن میری گزارش ہے کہ اس سلسلے میں تورات کا بیان خود طرح طرح کے اضطراب ہے مثلاً:

۱۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت سارہ کی عمر میں صرف دس برس کا فرق تھا کیونکہ تورات کی روایت کے مطابق جب حضرت سارہؓ کو حضرت اسحٰق علیہ السلام کے پیدا ہونے کی بشارت ملی۔

"تب ابراہام سرنگوں ہوا اور ہنس کر دل میں کہنے لگا کیا سو برس کے بڈھے سے کوئی بچہ ہوگا اور کیا سارہ کے جو نوّے ۹۰ برس کی ہے، اولاد ہوگی؟" (پیدائش باب ۱۷ آیت ۱۸)۔

۲۔ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام حاران سے کنعان کی طرف روانہ ہوئے تو ان کی عمر پچھتّر ۷۵ برس کی تھی۔ (پیدائش باب ۱۲، آیت ۵) گویا اس وقت حضرت سارہ پینسٹھ برس کی ہوں گی۔

۳۔ بادشاہ مصر کے روبرو، حضرت سارہ کو بہن قرار دینے کا معاملہ حسب روایتِ تورات، اس سے بھی بعد پیش آیا اور حضرت سارہ اس وقت تک پینسٹھ برس سے متجاوز ہوں گی۔

پھر کیا کوئی فرد بہ سلامت ہوش و حواس یہ ماننے کے لیے تیار ہو سکتا ہے کہ جو خاتون پینسٹھ اور ستر برس کے درمیان تھی اس سے شاہ مصر شادی کے لیے مضطرب ہوا ہوگا یا ہو سکتا ہے؟

غرض عمارت "کذب" کے دو ۲ ستون پہلے گر چکے تھے۔ رہا تیسرا ستون تو وہ درحقیقت ستون نہیں محض وہم کی تخلیق ہے۔

برق افگنی کے مزید کرشمے:۔

صاحب تحریر کے ابرِ غیظ کی برق افگنی اس معاملے پر ختم نہیں ہوئی بعض اور مطالب بھی

اس کی زد میں آ گئے ہیں، ایک مقام پر تو انہوں نے کمال ہی کر دکھایا، فرماتے ہیں:

"وہ خود (یعنی مولانا آزاد) محض ماہرینِ آثارِ قدیمہ کی تحقیقات اور روایات کو، جو سراسر ظنی اور وہمی ہوتی ہیں، بنیاد بنا کر قرآن مجید کی تفسیر اور نتائج کا استخراج کرتے ہوئے حدیثی اور روایتی تفسیر قرآن میں بہت سی "بوالعجبیوں" کی نشان دہی کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ ظنی اور وہمی تحقیقات تفسیر قرآن کا مستند ترین ماخذ ہے۔ چنانچہ قرآن کے ذوالقرنین کو وہ قطعی طور پر سائرس خیال کرتے ہیں، حالانکہ مولانا کے اس قطعی یقین کا ماخذ قرآن کا فرمودہ نہیں۔"

بے اصل و اساس:-

میں اس عبارت کو "کذب" قرار دوں تو شاید اس لفظ کی "شرعی اور لغوی حیثیت" کا مسئلہ سامنے آ جائے البتہ یہ عرض کرنے سے باز نہیں رہ سکتا کہ یہ محض بے اصل و اساس ہی نہیں صریح افترا ہے۔ کیونکہ "ترجمان القرآن" کی دونوں جلدوں کے کم و بیش بارہ سو صفحات بلکہ ابتدا سے آخر تک مولانا کی تحریرات کے ہزاروں صفحات میں سے ایک سطر یا سطر کا ایک ٹکڑا بھی ایسا نہیں پیش کیا جا سکتا جس میں اثری تحقیقات کو "مستند ترین ماخذ" تفسیر کہا گیا ہو، مانا گیا ہو یا اس حیثیت میں اس سے کام لیا گیا ہو۔ جس آیت کی تفسیر سے تہمتِ کذب کا قطعی ازالہ کیا گیا، اس میں بھی کہیں اثری تحقیقات کا ماخذ زیر غور نہیں آیا۔ صرف آیت کے موقع و محل کی تشریح الفاظ کے مطابق کھول کر کی گئی اور بتایا گیا کہ اس کا مفہوم کیا جا سکتا ہے۔ لیکن نہ یہ "حدیثی اور روایتی تفسیر" کی "بوالعجبی" ہے، نہ اس میں آثارِ قدیمہ کی سراسر ظنی اور وہمی تحقیقات کا کہیں ذکر آیا ہے۔ نہ کسی مقام پر قرآن مجید کی کسی آیت یا اس کے کسی ٹکڑے کی تشریح آثارِ قدیمہ کی بنا پر کی گئی ہے البتہ اگر آثارِ قدیمہ کی کوئی چھان بین قرآن مجید کے کسی بیان کی مؤید ثابت ہوتی ہے تو اسے تائید میں پیش کر دینا گناہ نہیں۔ اصول عربیت، سیاق و سباق یا کسی بھی مستند طریقے سے اس تفسیر پر اعتراض کیا جا سکے تو ضرور کیجیے لیکن افترا کی بت تراشیوں سے کام لینا تو بے چارگی کی دلیل ہے۔ جو کم حوصلہ افراد کا آخری ماٰئن ہے۔

کیا یہ مقصدیت ہے جس کی محرومیت کے احساس نے آپ کو اضطراب کے شعلہ زار میں پہنچایا؟ کیا یہ قرآن و احادیث میں گہری بصیرت سے پردامنی ہے اور کیا اسے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی تعلیمات سے کامل واقفیت کی آئینہ داری سمجھا جائے گا:

اے حسن گر از راست نہ رنجی، سخنے ہست

ناز ایں ہمہ، یعنی چہ؟ کمر ہیچ و دہاں ہیچ

کیا یہ سمجھا جائے کہ آپ کے پاس چونکہ کوئی صحیح اور مستند بات کہنے کے لیے تھی نہیں لہذا ہیر پھیر سے ایک چیز گھڑی اور اس مرحوم کے ذمے لگا دی جو جواب دہی کے لیے اس دنیا میں موجود نہیں۔ یہ طریقہ اخلاقی، دینی، شرعی اور عام انسانی نقطہ نگاہ سے جو حیثیت رکھتا ہے، اس کی توضیح غیر ضروری ہے۔ یقین رکھیں کہ مولاناؒ نے چھیالیس سال کی علمی اور داعیانہ زندگی میں اس نوعیت کا ایک لفظ بھی اپنے لیے کبھی جائز نہیں سمجھا اور یہ بھی یقین رکھیں کہ علم حدیث کی حکمیت کو ایسے افسوسناک شیوؤں سے قطعاً کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔

باقی رہا "سائرس" کا معاملہ تو بزرگِ محترم! جب یمن کے ایک تبع کو ذوالقرنین کا تاج پہنایا جاتا رہا تو وہ بھی "فرمودۂ خدا" تھا۔ جب سکندر یونانی کو اس مسند پر بٹھایا گیا جو کتنا ہی بڑا فاتح ہو لیکن سخت ظالم اور بت پرست تھا اور اپنا سلسلۂ نسب جوپیٹر دیوتا سے ملاتا تھا تو وہ بھی درست تھا۔ پھر ترقی کی تو دار اگشتاپ کیانی سے جوڑ دیا، اس وقت بھی "فرمودۂ خدا" کے طلب گاروں میں سے کسی کی زبان نہ کھلی حالانکہ صرف تاریخی اعتبار سے بھی یہ باتیں اتنی فرومایہ اور غیر معقول تھیں کہ سمجھ میں نہیں آتا، کیا کہا جائے۔ مولاناؒ نے خالص تاریخ نیز بعض صحائفِ تورات کے اشاروں کی روشنی میں ایک ایسی شخصیت متعین کرنے کی کوشش کی جس پر قرآن کے ذوالقرنین کا لباس غیر موزوں نہ ہو۔ تاہم انھوں نے کہیں نہیں کہا کہ آپ اسے ضرور مانیں، کہیں نہیں لکھا کہ یہ "فرمودۂ خدا" ہے۔ ذوالقرنین کو "سائرس" ماننا عقائدِ اسلام کا جزو نہیں۔ ساتھ ہی یقین رکھیں کہ "أَنَّا لِلّٰهِ لَا كِبْدٌ نَّ أَصْنَامَكُمْ الآية" بہرحال ہر شائبۂ "کذب" سے پاک و مبرا ہے اور مولاناؒ کا یہ ارشاد بہرحال حق ہے اور ہمیشہ حق رہے گا۔

"نبوت ایک سیرت ہے، جو صرف سچائی سے بنتی ہے، حقیقت اور سچائی کے خلاف جو کچھ ہے، خواہ وہ کسی شکل اور کسی درجے میں ہو، نبوت کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتا۔"

صرف اتنا اور کہ ؎

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی

اب آبروئے شیوۂ اہل نظر گئی

آخری گزارش :-

یہ باتیں تو ایسی تھیں، جو مجھ فرومایہ علم و عقل کی سطح سے بہت اونچی تھیں۔ لیکن میرے محترم بزرگوار خفا نہ ہوں تو ایک بات اور بھی گوش گزار کرنے کا خواہاں ہوں۔

موصوف نے ابو سلمان صاحب شاہ جہان پوری کا ذکر جن افسوسناک الفاظ، حد درجہ ناخوشگوار انداز اور حوصلہ شکن طریق پر کیا، اس کے لیے وہ کون سی وجہ جواز پیش کر سکتے ہیں؟ فرض کیجیے میں زیادہ پڑھا لکھا نہیں یا تحریر میں مجھے مشاقی کا درجہ حاصل نہیں اور بالغ نظری و تحقیق سے بھی عاری ہوں لیکن لکھنے کا شوق ہے، خدمت کی تڑپ ہے تو کیا مجھے اس وقت تک انتظار کرنا چاہیے جب تک قرآن و حدیث میں گہری بصیرت سے دامن پُر نہ ہو جائے اور جب تک شاہ ولی اللہؒ کی تعلیمات سے وسیع واقفیت کے درجے پر نہ پہنچ جاؤں؟ یہ سب کچھ بھی بزرگوارِ محترم کے معیار پر پورا اترنا ضروری ہے، ورنہ رد کر دیا جائے گا۔ کیا انہوں نے کبھی سوچا کہ ان اوصاف سے متصف لوگ تو کروڑوں مسلمانوں میں سے شاید بہت ہی کم نکلیں لیکن ہر مسلمان کے لیے اسلامی اوصاف سے متصف ہونا تو لازم ہے۔ مثلاً گفتار میں نرمی اور ملائمیت، انداز حوصلہ شکنی کا نہیں بلکہ حوصلہ افزائی کا ہو، اسلوب ایسا ہو کہ متعلقہ شخص کو اپنی کوتاہی کی تلافی کا موقع ملے نہ کہ اس کا دل دو نیم ہو جائے۔ مولانا رومؒ نے فرمایا تھا۔

علم را بر دل زنی یارے بود

لیکن بزرگوارِ محترم نے تو علم سے یہ کام نہیں لیا بلکہ وہی صورت پیدا کرنی چاہی کہ۔

کی جس سے بات اس نے شکایت ضرور کی

قرآن مجید کے ارشاد میں "حکمت" اور "موعظۃ حسنۃ" کی تاکید ہے، لیکن موصوف نے جو کچھ فرمایا وہ تو ان دونوں عنوانوں میں سے کسی کے بھی تحت نہیں آتا۔ کیا مجھ ایسے ناچیز طالبانِ علم کو کلیم ہمدانی کا ہم زبان ہونا چاہیے؟ جو کہتا ہے :

زاہدانِ ایں زماں معیارِ حق و باطل اند
ہر چہ را منکر شوند ایں قوم باور می کنم

مولانا محمد شعیب عمری

فنِ حدیث میں مولانا آزادؒ کا تبحّر

امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ ان نخبۂ رجال میں سے ایک تھے، جو نہ صرف قدرت کے رنگارنگ کمالات اور حیرت انگیز کرشمہ طرازیوں کا مجموعہ ہوتے ہیں، بلکہ افقِ عالم پر آفتابِ جہاں تاب کی طرح درخشندہ ہو کر علوم و معارف کی روشنی سے سارے عالم کو منوّر کر جاتے ہیں۔

بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مولانا آزاد کو علوم و فنون کے ہر شعبہ میں اور فکر و نظر کی ہر وادی میں اس فیاضی سے نوازا تھا، کہ وہ منتہائے کمال پر جلوہ افروز ہو گئے نیز ان کے دل و دماغ کو "کتاب اللہ" اور "احادیثِ رسول اللہ" کے علوم و معارف اور حقائق و اسرار کے انکشاف کے لیے چن لیا تھا۔ چنانچہ خود ہی بطور تحدیثِ نعمت ارشاد فرماتے ہیں:

"اگر تم کہو کہ حقائق و معارف کی طرف رہنمائی ایک فضلِ مخصوص ہے، جس کے انکشاف کے لیے خدائے تعالیٰ نے اس عاجز و درماندہ قلب کو چن لیا ہے تو یہ فی الحقیقت سچ ہے۔ ویا لیت قومی یعلمون بما غفرلی ربی وجعلنی من المکرمین۔ البلاغ ۲

یہ مسلّمہ حقیقت ہے کہ قرآن و سنت کے اسرار و معارف کا انکشاف صرف اللہ تعالیٰ کے اختیار اور فضل و عطا پر منحصر ہے۔ وہ کتاب و سنت کے علوم و حکم کے دروازے جس پر چاہے، کھول دے، اور چاہے جتنے حقائق کو بے نقاب کر دے، لیکن اللہ تعالیٰ اسی دل کو کتاب و سنت کے اسرار و معارف کی تجلّی گاہ بناتا ہے، جو لباسِ تقویٰ سے مزین ہو مولانا فرماتے ہیں:

"جو دل زادِ تقویٰ سے محروم اور ہوائے نفسانی و آلائشِ دنیا پرستی میں گرفتار ہے، وہ ایک لمحہ کے لیے بھی قرآن کے حقائق و معارف کی تجلّی گاہ نہیں بن سکتا، علم و فضل اس کے لیے بالکل بے کار ہے اور ذہن و دماغ کو یہاں کوئی نہیں پوچھتا۔

ذٰلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء ۞

ماخذ: صحیفہ، عمرآباد (بنگلور۔ انڈیا) سالنامہ ۱۹۷۰ء

از منطق و حکمت نکشاید در محبوب
اینہا ہمہ آرائش و افسانۂ عشق ست

یقین فرمایئے کہ جو کچھ عرض کر رہا ہوں، بالکل صحیح ہے قرآن کے اسرار و معارف میں ایک غیر متقی انسان کے لیے کوئی حصہ نہیں، گو وہ علم و فضل کے تمام مدارج طے کرلے" (الہلال ۸ ستمبر ۱۹۱۲ء)

سطور بالا میں جو عرض کیا گیا ہے، اس کی روشنی میں مولانا آزادؒ کی بے نظیر تفسیر "ترجمان القرآن" کا نہایت دقیقہ رسی اور ژرف نگاہی سے مطالعہ کیجیے گا، تو آپ پر یہ حقیقت نہایت طلعت زیبائی کے ساتھ منکشف ہوگی، کہ مولاناؒ نے ایک طرف قرآن حکیم کی بے پناہ معجزانہ تاثیر، اس کی لطافت اور شیرینی کو نیز اس کے دلکش پیرایۂ بیان اور وجد آفریں اسلوب کو جذب کر کے اپنے قلم کی وساطت سے عبارت کے ایک ایک جملے اور ایک ایک سطر میں منتقل کر دیا ہے، تو دوسری طرف اس کے ایک ایک صفحے میں ظاہری جمال آرائیوں اور حسن افروزیوں کے ساتھ حقائق و دقائق کے فانوس اس انداز سے روشن کر دیے ہیں کہ نگاہیں خود بخود اسرار و حکم کے موتی چننے لگتی ہیں اور اوراقِ دل کا ایک ایک صفحہ اور اس کی ایک ایک سطر ایمان و یقین، عشقِ خالق اور محبتِ رسولؐ کے انوار و تجلیات سے چمک اٹھتی ہے۔

اور بلاشک و ریب یہ بھی حقیقت ہے کہ قرآن و سنت کے اسرار و معارف کے انکشاف کی دولتِ لازوال، اُن ہی افرادِ قدسیہ کو مرحمت ہوتی ہے، جو تقربِ الٰہی کے وصفِ خصوصی سے متصف ہوں، الحمدللہ مولانا آزادؒ اس وصف کے تخلق سے محروم نہ تھے، انہوں نے اسی تقربِ الٰہی کی شمع سے اپنے دل کو روشن کیا تھا، چنانچہ مولانا غلام رسول مہر مرحوم کے نام ایک مکتوب مورخہ ۸ جنوری ۱۹۲۹ء میں درجِ ذیل کلمات ان کے قلم حقیقت رقم سے بے اختیار نکل گئے۔ فرماتے ہیں:

"ایک حدیثِ قدسی ہے "من تقرب الی شبرا، تقربت الیہ ذراعاً" عمر بھر میری کوشش یہی رہی ہے کہ اس وصف کے تخلق سے محروم نہ ہوں، اب بھی اس پر عامل ہوں اور عامل رہوں گا۔" (نقشِ آزاد ص ۱۶۷)

مولانا آزادؒ سرچشمۂ علوم الٰہی کے فیضان سے بہرہ یاب تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کو جس طرح قرآنِ حکیم کی تفسیر کے لیے، قرآن کی روح کو ان کے قلب و دماغ کے ایک ایک ریشے میں جذب کر دیا تھا، اسی طرح سنّتِ رسولؐ کے حقائق و معارف اور اسرار و حکم کی تشریح و توضیح کے لیے بھی شرح صدر فرمایا اور ان کے معارف نگار قلم کو جو اعجاز اور اثر ودیعت فرمایا، اُس کا اظہار الفاظ میں ممکن نہیں۔ لیکن قارئین کرام اس نوع کی تحریرات کا مطالعہ فرمائیں تو انہیں یقیناً محسوس ہوگا، کہ ان کے اپنے دل و دماغ کے بند دروازے کس طرح کھلنے لگے ہیں اور ان میں اسرار و حکم سنت کی روشن شمعیں کیسی جگمگانے لگی ہیں، یہاں ضرورت اس امر کی ہے کہ مذکورہ حقیقت کو امثال و شواہد کی روشنی میں اُجاگر کیا جائے، اگرچہ طول بیانی کی نہ مہلت ہے نہ گنجائش، تاہم کوشش کروں گا کہ چند ایمان افروز مثالیں پیش کر دوں، مناسب معلوم ہوتا ہے اس سے قبل فنِ حدیث کی عظمت اور اس کے مصدرِ علم ہونے پر مولاناؒ کے جواہر نگار قلم سے جو عبارت مرصّع ہوئی ہے، وہ قارئینِ کرام کی نظرِ گرامی سے گزر جائے، چنانچہ ملاحظہ فرمائیے، مسئلہ "ایلاء و تخییر" سے متعلق وارد بعض روایاتِ موضوعہ و ضعیفہ پر جن سے بالعموم مخالفین و اعدائے اسلام استناد و استدلال کرتے ہیں، نہایت محققانہ روشنی ڈالنے کے بعد رقم طراز ہیں۔

"حدیث" مصدرِ علم اور مدوّن و منضبط فن :

"قرآنِ کریم کے بعد یقیناً اور حتماً احادیثِ صحیحہ کا درجہ ہے، اور بغیر کسی خوف اور تامل کے اس کا اعتراف کر لینا چاہیے کہ حدیثِ صحیح ایک ایسا مصدرِ علم ضرور ہے، جو ہمارے لیے دلیل اور حجت ہو سکتا ہے اور جس طرح ہم اپنے داخلی اعمال میں احادیث کے معترف و معتقد ہیں، بالکل اسی طرح خارج کے اعتراضات میں بھی ان کی حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں۔

لیکن حدیث ایک مدوّن و منضبط فن ہے جس کے اصول و قواعد ہیں اور اس کی جمع و ترتیب کا کام صدیوں تک جاری رہا ہے، اس لیے صحت و اعتبار کے لحاظ سے مختلف طبقات و مدارج میں منقسم ہو گیا ہے، اس کی بنیاد انسانوں کی روایت پر تھی، اس لیے اصول شہادت و روایت کی بنا پر ضروری تھا، کہ نقدِ روایت

کے اصول وضع کیے جاتے اور وضع کیے گئے۔

اس پورے کرۂ ارضی کے اندر جس میں انسان نے ہزارہا برس کے تجارب و محن کے بعد صدہا علوم و فنون تک رسائی حاصل کی ہے اور ہر قوم نے علم کی تفتیش و تدوین میں حصہ لیا ہے، بے خوف، دعوے کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ کسی علم و فن کو بھی انسانی دماغ نے اس درجہ منضبط، اور سعیِ انسانی کی انتہائی حد تک مرتب و مہذب نہیں کیا جیسا کہ علمائے سلف نے "فنِ حدیث" کو ــــ اور یہ ایک مخصوص شرف و مزیت علمی ہے امتِ مرحومہ کی جس میں دنیا کی کوئی قوم شریک و سہیم نہیں۔" (الہلال ۱۳، ۲۰ مئی ۱۹۱۴ء ص ۳۷۴)

"اختلاف امتی رحمۃ":

مولانا آزادؒ نے "الہلال" کے ضبط ہو جانے کے بعد "البلاغ" کے نام سے ہفت روزہ رسالہ ۱۹۱۵ء میں نکالا، تو اس کے پہلے اور دوسرے نمبر میں انہوں نے نہایت فصیح و بلیغ مقالہ افتتاحیہ عربی زبان میں تحریر فرمایا تھا، نمبر اول کے مقالۂ افتتاحیہ کے آخری صفحے میں مولاناؒ نے جہاں حدیث "لتسون صفوفکم اولیخالفن اللہ بین وجوھکم" پر بحث فرمائی ہے، وہاں تعجب و انکار کے لہجہ میں تحریر فرما دیا تھا، جس کا حاصل یہ ہے:

"آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تو نماز کی صفوں میں ہمارے قدموں کے اختلاف کو پسند نہیں فرمایا تھا، لیکن افسوس ہمارا حال یہ ہے کہ ہم سرے سے نماز کی جماعتوں ہی میں اختلاف کر بیٹھتے ہیں اور ہمارا ہر گروہ ایک ہی وقت میں اپنی الگ الگ جماعت "مسجدِ حرام" میں قائم کر لیتا ہے اور پھر تعجب ہے اس اختلاف کو اپنے لیے رحمت سمجھتا ہے اور کہتا ہے کہ اُمت کا اختلاف رحمت ہے؟"

مولانا علی احمد صاحب مدراسیؒ نے مذکورہ عبارت کو پڑھ کر مولانا آزادؒ کو لکھا کہ "آپ کے تعجب انگیز اندازِ تحریر سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مشہور و معروف حدیث "اختلاف امتی رحمۃ" کے تسلیم کرنے میں آپ کو تأمل ہے؟ براہ کرام اس موضوع پر اپنی رائے اور تحقیق سے شاد کام فرمائیے!"

اس استفسار کے جواب میں مولانا آزادؒ کے خامۂ عنبر شمامہ نے "البلاغ" مورخہ ۱۷، ۲۴ دسمبر ۱۹۱۵ء میں جس عام فہم، سلیس مگر دل آویز انداز میں حدیثِ مذکورہ کے اسناد و طرق پر محدثانہ رنگ میں بحث کی ہے اور پھر حدیث "اختلاف اصحابی رحمۃ لامتی" کے مطالب، دقائق پر جو ایمان افروز روشنی ڈالی ہے، اس کی مثال ملنی مشکل ہے، مطالعہ فرمایئے اور دیکھیے، افہام و تفہیم کی دل نشینی، اسلوب بیان کی شیرینی اور طرز نگارش کی شگفتگی کے ساتھ انوار معانی کی صبح درخشاں کس طرح لفظ لفظ میں جھلک رہی ہے؟۔ فرماتے ہیں:

"بلاشبہ آپ کا یہ خیال درست ہے، کہ فاتحہ کی عبارتِ منقولہ کا انکار و تعجب اس حدیث کے سوال تک منتہی ہوتا ہے لیکن نفسِ حدیث تک نہیں، بلکہ حدیث کے اس مطلب تک جو عام طور پر لوگوں نے سمجھا ہے، اور عموماً فتنۂ اختلافِ تحزّب و تمذہب کے مباحث میں اس سے استدلال کیا جاتا ہے۔

فقیر کا اس جملے سے مقصد صرف یہ تھا کہ جس وجودِ اقدسؐ (روحی فداہ) کو اُمت کا تقدیم و تاخیر قدم میں اختلاف گوارا نہ تھا، اُس کی امت عقائد و عبادات میں مجمۂ اختلاف و شقاق بن گئی ہے، اور پھر کہتی ہے کہ یہ رحمت ہے، اگر یہ رحمتِ الٰہی ہے تو بقول جاحظ کے "عذاب الٰہی یقیناً اتفاق و اتحاد ہوگا" فنعوذ باللہ من شرور انفسنا و من سیئات اعمالنا۔

رہا اس حدیث کی صحت و عدمِ صحت کا سوال، تو اگر میں آپ کے اور عامۃ الناس کے پیش کردہ الفاظ ہی پر اڑ جاؤں، تو بلا تامل کہہ دے سکتا ہوں کہ اس کی کوئی اصلیت نہیں۔ ع

قصہ کوتہ گشت ورنہ دردِ سر بسیار بود

مگر اس عاجز کا مقصود ہمیشہ تحقیق و کشفِ حق رہتا ہے، نہ مکابرہ و مجادلہ۔ پس واضح ہو کہ جن الفاظ کے ساتھ آپ نے اس حدیث کو لکھا ہے، اگر اس سے قطع نظر کر لیا جائے اور صرف اختلاف کو پیش نظر رکھا جائے تو بلاشبہ اختلاف اصحابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ہے (نہ کہ اختلاف امت کے متعلق)۔

باختلافِ الفاظ ایک روایت بعض محدثین نے درج کی ہے۔ اور چاہیے کہ اس کے تمام طرق و مسانید پر نظر ڈالی جائے۔

طرق و مسانید پر تفصیلی نظر:

حافظ سخاویؒ نے "مقاصد" میں اس کی تمام روایتیں جمع کردی ہیں، اور دیگر طرق کا حال بعض متاخرین کی کتابوں سے معلوم ہوجاتا ہے، میں ان تمام طرق کو جمع کرتا ہوں:

(۱) بیہقیؒ نے "مدخل" میں روایت کی ہے: "عن سلیمان ابن ابی کریمة عن جویبر عن الضحاک عن ابن عباس قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مهما اوتيتم من كتاب الله فالعمل به لا عذر لاحد فی ترکه، فان لم یکن فی کتاب اللہ فسنة منی، فان لم تکن سنة منی فما قال اصحابی۔ ان اصحابی بمنزلة النجوم فی السماء فایما اخذتم به اهتدیتم واختلاف اصحابی لکم رحمة۔"

یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

کتاب اللہ پر عمل کرو، اس کے ترک کے لیے کسی کا عذر مسموع نہیں، اگر کتاب اللہ میں کسی معاملہ کو نہ پاؤ تو میری سنت پر عمل کرو، اگر میری سنت نہ پاؤ تو میرے اصحابؓ کے اقوال کو ڈھونڈو، میرے اصحابؓ ایسے ہیں جیسے آسمان میں ستارے، ان سے جو کچھ لوگے، اس میں ہدایت ہوگی اور اختلاف میرے اصحابؓ کا تمہارے لیے رحمت ہے ——— انتہیٰ ملخصاً

(۲) طبرانیؒ اور دیلمیؒ نے اپنی "معجم" و "مسند" میں بھی اسی طریق سے روایت کی ہے، اور انہی الفاظ سے۔

(۳) نصر مقدسیؒ نے "کتاب الحجة" میں مرفوعاً اسی روایت کو نقل کیا ہے اور زرکشیؒ نے اس کا ذکر کیا ہے، مگر اسناد نہیں لکھی ہے۔

(۴) اسی طرح عراقیؒ نے ادم بن ایاس کا حوالہ دیا ہے، لیکن لکھا ہے کہ مرسل اور ضعیف ہے،

ان کی روایت کے الفاظ یہ ہیں: "اختلاف اصحابی رحمۃ لامتی"۔

(۵) بیہقیؒ نے "رسالۂ اشعریہ" میں درج کیا ہے، مگر بغیر اسناد۔

(۶) بیہقیؒ نے "مدخل" میں قاسم بن محمد کا قول بروایتِ سفیان عن افلح بن حمیدؒ نقل کیا ہے کہ "اختلاف اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم رحمۃ لعباد اللہ اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اختلاف، اللہ کے بندوں کے لیے رحمت ہے۔

(۷) قتادہؒ کہتے ہیں کہ عمر بن عبدالعزیزؒ کہا کرتے تھے: "ماسرنی لوان اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم لم یختلفوا، لانھم لولم یختلفوا، لم تکن رخصۃ"، یعنی اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحابؓ میں اختلاف نہ ہوتا، تو امت کے لیے آسانی اور رخصت کی وسعت نہ ہوتی۔

یہاں تک تو ہم نے حافظ سخاویؒ کی "المقاصد" سے نقل کیا ہے۔ (ص ۱۲ مطبوعہ لکھنؤ)

لیکن طبقاتِ ابنِ سعد میں قاسم بن محمد کا وہ قول موجود ہے جو بیہقیؒ نے "مدخل" میں نقل کیا ہے۔ کہ "اختلاف اصحاب رسول اللہ رحمۃ للناس"۔

ابن حجر مکیؒ نے بھی "الدرر المنتشرہ" میں اس کے مختلف طرق کو جمع کرنا چاہا ہے، مگر ان میں جو قابلِ ذکر تھے وہ سب اوپر آگئے، لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ ان تمام مخارج مندرجۂ صدر میں ایک صدا بھی ایسی نہیں ہے، جس سے اس روایت کو کچھ بھی تقویت مل سکے اور جس سے حسبِ اصول فن وقوم ثابت ہو سکے کہ یہ حدیث قابلِ احتجاج و استناد ہے۔

اس حدیث کے تمام مخارج پر نظر ڈالیے، دفعہ ۲ سے لے کر ۷ تک جس قدر مخارج ہیں، ان میں ایک حوالہ بھی ایسا نہیں ہے، جس سے کوئی توثیق و سند حاصل کی جا سکے، "طبرانی" اور "دیلمی" کا حوالہ کوئی سند نہیں ہے، وہی روایت ہے جو بیہقی نے مدخل میں درج کی ہے۔

"نصرِ مقدسی" کے متعلق "زرکشی"، "حافظ سخاوی" اور "ابن حجر مکی" سب کہتے ہیں کہ مرفوعاً روایت کی ہے مگر ساتھ ہی تصریح کرتے ہیں کہ اسناد معلوم نہیں اور جب اسنادِ معلوم نہیں تو محدثین نے فیصلہ کر دیا ہے کہ ایک منٹ کے لیے بھی قابل قبول نہیں۔

"حافظ عراقی" نے بہ تغیر الفاظ اسی روایت کو لکھا ہے، مگر اسناد اس کی بھی معلوم نہیں۔

"حافظ سخاوی" کہتے ہیں کہ ان کے نزدیک مرسل و ضعیف ہے، لیکن اگر اسناد بتلائی ہوتی تو معلوم کیا جا سکتا، کہ ارسال میں بھی اس کا کیا حال ہے اور ضعف کے کیا کیا اسباب ہیں؟

"بیہقی" نے ایک اور رسالہ میں بھی اسی روایت کو درج کیا ہے، مگر "حافظ سخاوی" کی زبانی آپ سن چکے ہیں کہ بغیر اسناد، پس وہ بھی کوئی نئی اور مفید سند نہیں۔

حدیث کے مخارج تو بس اسی قدر ہیں اب اس کے بعد صحابہؓ و تابعینؒ کے اقوال آتے ہیں، "بیہقی" نے مدخل میں "قاسم بن محمد" کا قول نقل کیا ہے، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحابؓ کا اختلاف بندگانِ خدا کے لیے رحمت ہے، لیکن یہ قاسم بن محمد" کا قول ہے وہ اُسے اوپر رفع نہیں دیتے۔

اسی طرح "قتادہ" کہتے ہیں کہ "عمر بن عبدالعزیزؒ" کہا کرتے تھے کہ اگر صحابہؓ اپنے اجتہاد و استخراج مسائل یا تنوع طریق و عمل میں مختلف نہ ہوتے، تو امت کے لیے رخصت اور وسعت و سہولت نہ ہوتی۔ اول تو یہ چیز ہی دوسری ہے، "اختلاف امتی" یا "اختلاف اصحابی" کے عموم سے اُسے کیا تعلق؟ پھر جو کچھ بھی ہے، "عمر بن عبدالعزیزؒ" کا قول ہے۔

آخر میں "طبقات ابن سعد" کا ذکر آیا ہے لیکن وہ بھی کوئی نئی سند نہیں۔ "قاسم بن محمد" کا وہی قول ہے جو "بیہقی" نے مدخل میں نقل کیا ہے۔

اب صرف وہ ایک ہی روایت رہ گئی، جو دیلمیؒ نے "مسند الفردوس" میں، طبرانیؒ نے "معجم" میں اور بیہقیؒ نے "مدخل" میں درج کی ہے، اس کے سوا اور کوئی اسناد ہمارے سامنے نہیں ہے۔ لیکن اس کا یہ حال ہے کہ روایت حضرت ابن عباسؓ کی ہے، جن سے "ضحاک" نے اور ضحاک سے "جویبر" نے روایت کی ہے، اربابِ فن و نظر کو معلوم ہے کہ حضرت ابن عباسؓ کی روایت بذریعۂ ضحاک کا کیا حال ہے؟ اور ائمۂ نقد کا کیا فیصلہ ہے؟ —— یہ ضحاک ابن مزاحم البلخی مشہور مفسر ہیں، لیکن ان کی احادیث کے متعلق "ائمۂ حدیث" نے اختلاف کیا ہے کہ درخور قبول ہیں یا نہیں؟ اگر اس اختلاف سے قطع نظر کر لیا جائے جب بھی یہ امر واضح طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے کہ ان کی ملاقات حضرت ابن عباسؓ سے ثابت نہیں اور نہ انہوں نے خود ابن عباسؓ سے کچھ اخذ کیا ہے۔ اس بنا پر ان کی تمام مرویات منقطع ہیں، اور یہ روایت بھی اسی میں داخل ہے۔

پھر "ضحاک" کے بعد اس کا راوی "جویبر" ہے۔ یہ "جویبر" وہی جویبر ابن سعید الازدی الخراسانی ہیں، جن سے محمد بن عبد اللہ فلسطینی اور اسلام بن یزید وغیرہ نے فضائل قرآن و نکاح وغیرہ میں بڑا ذخیرہ روایت کیا ہے، اور ان کی مجروحیت، کتب قوم میں مشہور ہے، ابن معینؒ کہتے ہیں کہ "لیس بشیٔ" یعنی وہ کچھ نہیں۔ نسائیؒ اور دار قطنیؒ جیسے ائمہ فن کا فیصلہ ہے کہ "متروک الحدیث" جوزجانیؒ نے کہا "لا یشتغل بہ"۔ مدارسیؒ نے "کشف الاحوال" میں ابن جوزیؒ اور سیوطیؒ کا نقد نقل کیا ہے کہ "متروک ......" (ص۲۹ مطبوعہ لکھنؤ)

ان تصریحات سے معلوم ہوا کہ "دیلمی" وغیرہ کی روایت کو اگرچہ "اختلاف امتی" سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ وہ صرف صحابہؓ کے اختلاف کے متعلق ہے؛ تاہم اس کی صحت کے لیے بھی کوئی سامان ہمارے پاس نہیں ہے، اور بہتر سے بہتر مخرج جو اس کا ہو سکتا تھا، اس کی اسناد بھی لائق احتجاج و اعتماد نہیں، چنانچہ اسی بنا پر "حافظ سخاوی" نے لکھا ہے:

فقد زعم کثیر من الائمۃ انہ لا اصل لہ"۔ (المقاصد ص۱۲)
(اور ائمہ فن میں سے ایک جماعت کثیرہ نے خیال کیا ہے کہ اس حدیث کی کوئی اصل نہیں!)

اس کے بعد خطابیؒ کی نسبت لکھا ہے، کہ انہوں نے "غریب الحدیث" میں لے لیا ہے اور جاحظ اور موصلی کے اس قول کا رد کیا ہے "لو کان الاختلاف رحمۃ لکان الاتفاق عذابا"۔ لیکن سوال اس رد و تغلیط کی نسبت نہیں ہے، کسی وجہ سے "خطابی" کی رائے یہی ہو گی۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ "اصول مقررۂ فن" کے مطابق بھی انہوں نے کوئی سند لکھی؟ یا توثیق و تصدیق کا خارج سے کوئی مزید اثر ڈالا؟۔ اس کا حال یہ ہے کہ خود "حافظ سخاویؒ" ہی لکھتے ہیں:

"ثم تشاغل الخطابی برد ھذا الکلام ولم یقع فی کلامہ شفاء فی عزو الحدیث ولکنہ اشعر بان لہ اصلا عندہ لیکن "اصلا عندہ" کا حسن ظن ہمارے لیے کیا مفید؟ ع

کہ خضر از آب حیواں تشنہ می آرد سکندر را

آپ پر واضح ہو کہ فن کا معاملہ نہایت نازک ہے اور اعتماد شخصی اور حسن ظن معتقدانہ یہاں کوئی چیز نہیں ــــ متاخرین عموماً اس اعتماد کی بنا پر اکثر روایتیں قبول کر لیتے ہیں اور کہتے

ہیں کہ "جب علماء نے لکھا ہے، تو گو انہوں نے سند نہیں لکھی، مگر ضرور کوئی نہ کوئی سند ان کے پاس ہوگی" ـــــ یہ بات محض حسن ظن کے لیے تو اچھی چیز ہے، لیکن اگر فن میں اس سے کام لیا جائے گا تو پھر کوئی "فن" فن باقی نہیں رہے گا۔ فن حدیث کے اصول ہیں، قواعد ہیں، جرح و نقد ہے، ائمۂ فن کی تصریحات ہیں، روایت ہے، درایت ہے۔ اور محدثین کرام رحمہم اللہ نے بالاتفاق ہمیں بتلا دیا ہے، کہ جس کی سند نہ بتلائی جائے، بلا تامل اُسے رد کردو۔ پھر ہم ان بزرگوں کے اصولوں پر عامل ہوں یا ان کی ـــــ جمع و گرد آوری ـــــ پر؟ ـــــ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ محدثین کرام کی احتیاطات فن کا یہ حال ہے، کہ وہ بغیر سند اور حوالۂ مخرج کے نقل حدیث تک کو جائز نہیں رکھتے؟۔ حافظ ابن الصلاحؒ کے مقدمہ کو دیکھیے کہ وہ "نوع اول" کے آخر میں کیا لکھتے ہیں؟ ـــــ علامہ نوویؒ کی "شرح مسلم" کی تصریحات پر نظر ڈالیے کہ انہوں نے نقل و روایت کے لیے کیا شرائط بیان کی ہیں؟ ـــــ انہی چیزوں کے لیے طبقۂ محدثین متوسطین" نے اصطلاح "الوجادہ" (بالکسر) وضع کی اور اس کی آٹھ (۸) قسمیں قرار دیں، جن کی رعایت کے بغیر نقل حدیث جائز نہیں:

"السماع والقراءة والاجازة والمشافهة والمناولة والمكاتبة واعلام الشيخ والوصية بالكتابة"۔

اس کے مقابلے میں آج کل کی حالت دیکھیے کہ اگر تصوف و مواعظ کی کسی کتاب میں کوئی روایت نظر سے گزر گئی تو بغیر علم اسناد و مخارج کے ہر صاحب عمامہ حق رکھتا ہے کہ بلا تامل استدلال و احتجاج کرے، اور پورے اطمینان سے کہہ دے کہ:

"قال رسول الله صلى الله عليه وسلم" اور اگر متاخرین فقہاء و عامۂ مصنفین کے یہاں اس کا سراغ چل گیا تو پھر تو اس کی توثیق میں کوئی شبہ ہی نہیں رہا اور جو شبہ کرے اس پر قطعاً انکار حدیث کا فتویٰ ہے۔!

اختلافِ صحابہؓ سے کیا مراد ہے؟:

آیئے! اس سے قطع نظر ہی کر لیں کہ اصل روایت کا کیا حال ہے؟ ـــــ اس کو دیکھیں کہ جن علماء نے اس پر اعتماد کیا ہے وہ "اختلاف" سے کون سا اختلاف مراد لیتے ہیں؟ ـــــ مختلف مذہبوں، جماعتوں، عقیدوں اور صُوَر و اشکال عبادات و اعمال کا اختلاف یا کوئی

اور اختلاف ؟۔

یہ تو آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ الفاظ مشہورہ "اختلاف امتی رحمۃ" کی کوئی اصلیت نہیں ملتی۔ البتہ اختلافِ صحابہؓ کے رحمت ہونے کے متعلق ایک سند بیان کی گئی ہے پس دیکھنا یہ ہے کہ بصورت صحت روایت، صحابہؓ کے اختلاف سے بھی کون سا اختلاف مراد ہے؟ کیا وہ اختلاف جس نے کئی دن تک حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ، کے مکان کا محاصرہ کیا، غذا اور پانی کو بند کیا اور بالآخر ان کی مظلومانہ شہادت کا باعث ہوا۔ کیا وہ اختلاف جس کی مختلف دو جماعتیں مدینہ اور مکہ سے نکلیں اور جس کا نام تاریخ نے "جنگ جمل" رکھا ہے۔

اگر یہ نہیں تو کیا وہ اختلاف، جس کی تواریں "صفین" میں بے نیام ہوئیں اور جس کی بدولت صدہا صحابہؓ کرام مقتول و شہید ہوئے۔

آپ یقیناً کہیں گے کہ "اختلافِ صحابہ" سے مراد یہ اختلاف تو کسی طرح نہیں ہو سکتا بلکہ کوئی اور اختلاف جو موجبِ قتال و جدال ہونے کی جگہ موجبِ رحمت و فیضان ہو سکتا ہے، چنانچہ جن علماء نے اس روایت پر اعتماد کیا ہے ان میں سے بھی بعض نے صاف صاف تصریح کر دی ہے کہ اختلاف سے مراد مذہب و جماعت اور فرقہ بندی کا اختلاف نہیں ہے، بلکہ فہم و تدبرِ مسائل، اجتہاد و طرز اجتہاد، استنباط و طرزِ استنباط، مسالکِ مختلفۂ علم و عمل اور طریق سلوک و مجاہداتِ دینیہ کا اختلاف مراد ہے، یا کوئی اسی طرح کا اختلاف جو امت کے لیے ایک نظیر اور اسوہ ہونے کے لحاظ سے، نیز نتائج و اتباع کے لحاظ سے رحمت تھا۔

اصل یہ ہے کہ روایت میں جس طرح "اختلاف" کا لفظ آیا ہے اور جس ترتیب سے آیا ہے، وہ خود بتلا رہا ہے، کہ اختلاف سے مقصود کیا ہے؟۔

روایت کا موضوع یہ ہے کہ امت کے لیے عمل و اتباع کے اصول و مخارج کیا کیا ہیں؟

—— فرمایا کہ سب سے پہلے کتاب اللہ ہے، قرآن مجید میں جو کچھ تمہیں دے دیا گیا اور جو کچھ بتلا دیا گیا، کسی حال میں اس سے اغماض و غفلت نہیں کرنا چاہیے، لیکن اگر ایسے معاملات پیش آجائیں کہ ان کی تفصیل و جزئیات سے قرآن حکیم خاموش ہو تو سنت کی طرف متوجہ ہو اور دیکھو کہ حاملِ قرآن کا اسوۂ حسنہ کیا کہتا ہے؟ اگر یہ بھی خاموش ہو تو عہد نبوت کی صحبت یافتہ اور طیار

کردہ جماعت کے اجتہاد اور قضایا ہیں، ان کو دیکھو کہ کیا روشنی بخشتے ہیں؟۔

لیکن چوں کہ فہم و استنباطِ مسائل و تعلیمات میں ہر دماغ ایک خاص حال رکھتا ہے، اس لیے ضرور ہے کہ صحابہؓ کے اجتہادات میں بھی اختلاف ہوا اور ایک ہی مسئلہ کے متعلق مختلف صحابہؓ مختلف رائیں رکھتے ہوں، پس فرمایا کہ ان کے اس اختلافِ اجتہاد اور تعددِ طرق فہم و استنباط سے مایوس نہ ہونا چاہیے۔ یہ اختلافِ اجتہادِ طبیعی ہے، اور یہ کوئی مصیبت نہیں، بلکہ رحمت ہے، اگر فہم و اجتہاد میں اختلاف نہ ہوتا، تو دنیا کی عقلی و دماغی ترقی رک جاتی چنانچہ یہ بالکل بیان واقعہ ہے، ہر شخص جانتا ہے کہ فہم استنباطِ مسائل و طرقِ استدلال و اجتہاد میں صحابہ کرام مختلف تھے، مگر چونکہ جماعت بندی اور تمذہب و تحزب نہ تھا" الی اللہ والی الرسول" کے آگے سب کی گردنیں جھکی ہوئی تھیں اور ہر شخص اپنی رائے و قیاس کو کتاب و سنت پر عرض کرتا تھا اس لیے ان کا اختلاف یقیناً رحمت تھا جس سے شریعت کے حقائق ابھرے اور اس کا ہر گوشہ نمایاں ہوا، اُن کا اختلاف وہ اختلاف نہ تھا، جو دراصل ایک عذابِ الٰہی ہے، اور جس کی نسبت امتِ مرحومہ کو وصیت کی گئی تھی کہ:

لَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ!

حضرت ابن عباسؓ "تمتع بالعمرہ الی الحج" کے وجوب کے قائل تھے، بعض دیگر صحابہؓ کو اس سے اختلاف تھا، جب عروہؓ نے ان سے کہا کہ "افرادِ حج" افضل ہے، تو انہوں نے کہا: "تمتع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" عروہؓ نے کہا: "ولکن ابوبکر وعمر لم یفعلا۔" (لیکن حضرت ابوبکرؓ اور عمرؓ نے نہیں کیا) اس پر حضرت ابن عباسؓ نے غضب ناک ہوکر ـــــ اور "فردوہ الی اللہ والرسول"، کی روح القدس سے معمور ہوکر فرمایا:

" یوشك ان ینزل علیکم حجارۃ من السماء اقول قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، وتقولون قالا ابوبکر وعمر ممکن ہے کہ تم پر آسمان سے سنگ باری ہو۔ میں کہتا ہوں کہ کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے، اور اس پر تم حجت لاتے ہو، کہ کہا ابوبکرؓ وعمرؓ نے؟ ع

چو غلام آفتابم ہمہ ز آفتاب گویم
نہ شبم، نہ شب پرستم کہ حدیثِ خواب گویم

اسی واقعہ سے اندازہ کر لیجیے کہ "فردوہ الی اللہ والرسول" کا کیا جاہ و جلال صحابۂ کرامؓ کی نظروں میں تھا؟ اور جب حالت یہ تھی تو ظاہر ہے کہ ان کا اختلافِ فہم و اجتہاد کیوں نہ موجبِ رحمت ہوتا؟۔

صحابۂ کرامؓ کے اندر "سماع موتی" میں اختلاف تھا، "لیلۃ الاسراء" کے متعلق اختلاف تھا، "تیممِ جنابت" کے متعلق اختلاف تھا، "وجوبِ غسل از اکسال" کے متعلق حضرت عائشہؓ کا فتویٰ اور تھا حضرت علی، عثمان، طلحہ، ابوایوب اور ابنِ کعب (رضی اللہ عنہم) کا فتویٰ دوسرا تھا، لیکن ان میں سے کوئی اختلاف بھی فتنۂ تحزب و تشیع (تشیع یعنی فرقہ بندی اور گروہ گروہ ہوجانا، یہاں "تشیع" سے مصطلح فرقہ "شیعہ" نہیں ہے) تک منجر نہ ہوا، یہی معنیٰ "اختلاف اصحابی رحمۃ" کے ہیں اور فی الحقیقت یہ اختلاف رحمتِ الٰہی تھا۔

چنانچہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا جو قول "قتادہؒ" نے نقل کیا ہے وہ صاف صاف واضح کر رہا ہے کہ مقصود اختلاف سے اسی قسم کا اختلاف ہے نہ کہ اختلاف تمذہب و تحزب۔ کیوں کہ انہوں نے کہا کہ اگر اختلاف نہ ہوتا، تو امت کے لیے توسیع اور رخصت کی سہولت نہ ہوتی۔

ابن حجر مکیؒ نے یہ بھی لکھا ہے کہ: "وقیل المراد اختلافھم فی الحرف والصنائع" یعنی یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہاں اختلاف سے مقصود مختلف حرفتوں اور صنائع کا اختلاف ہے، اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اختلافِ تشیع و تمذہب مقصود نہیں۔

اختلافِ صحابہؓ اور قرآن:

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے عزائم و رخص کی طرف اشارہ کیا ہے، اور یہ بتلایا ہے کہ مقصود "اختلافِ افکار" نہیں، بلکہ "اختلافِ اعمال" ہے یعنی اگر تمام صحابۂ کرامؓ ایک ہی طرح کی عملی زندگی بسر کرتے، تو ایک طرف تو تقسیمِ عمل کے قدرتی اصول کی بنا پر صدہا اعمالِ ضروریہ کا دروازہ بند ہو جاتا، دوسری طرف جو نمونہ امت کے لیے قائم ہوتا وہ ناقابلِ عمل و اتباع ہوتا۔

حضرات صحابۂ کرامؓ کو ہم دیکھتے ہیں، کہ انہوں نے عملِ صالح اور طلب مصالح کے وہ تمام مختلف طریقے اختیار کیے جن کا ہر امت عادلہ و صالحہ کے اندر رہنا ضروری ہے سب ایک ہی راہ جہد و طلب کے عامل نہ تھے، ایک جماعت تھی جس نے تفقہ فی الدین کی طرف زیادہ توجہ کی اور علوم نبویہؐ کی حامل و محافظ ہوئی، ایک جماعت تھی جس نے زیادہ وقت جہاد و قتال فی سبیل اللہ میں صرف کیا اور دشمنان حق سے شریعت کو محفوظ کیا، ایک گروہ وہ تھا جس نے طلبِ معاشِ صالح اور تجارت و کسبِ حلال پر زیادہ وقت صرف کیا اور اس طرح ان کی تاجرانہ زندگی بھی اشاعتِ حق و تبلیغ احکام و تائید و نصرتِ دین کا ذریعہ بنی۔ غور کیجیے کہ جو کچھ کہہ رہا ہوں، کس طرح ٹھیک ٹھیک قرآن حکیم سے ماخوذ ہے، خود اللہ تعالیٰ نے "سورۂ مزمل" کے آخر میں صحابۂ کرامؓ کے مجموعی اعمالِ مقدسہ و طیبہ کی تصویر کھینچی ہے:

إِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ أَنَّكَ تَقُومُ أَدْنَىٰ مِن ثُلُثَيِ اللَّيْلِ وَنِصْفَهُ وَثُلُثَهُ وَطَائِفَةٌ مِّنَ الَّذِينَ مَعَكَ ۚ وَاللَّهُ يُقَدِّرُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۚ عَلِمَ أَن لَّن تُحْصُوهُ فَتَابَ عَلَيْكُمْ ۖ فَاقْرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ ۚ عَلِمَ أَن سَيَكُونُ مِنكُم مَّرْضَىٰ ۙ وَآخَرُونَ يَضْرِبُونَ فِي الْأَرْضِ يَبْتَغُونَ مِن فَضْلِ اللَّهِ ۙ وَآخَرُونَ يُقَاتِلُونَ فِي

"بے شک تمہارا پروردگار تمہاری ہر حالت کی خبر رکھتا ہے، اور تم جو کچھ کرتے ہو، سب اس کے سامنے ہے، وہ جانتا ہے کہ تم راتوں کو تقریباً دو تہائی رات تک یا آدھی آدھی رات اور ایک ایک پہر تک ذوقِ عبادت میں مستغرق کھڑے رہتے ہو اور تمہارے اصحابؓ میں سے بھی ایک جماعت اس عالم میں تمہارے ساتھ ہوتی ہے، اللہ نے رات اور دن کی تقسیم اوقات کی ایک تقدیر کر دی ہے اور وہی ان کا اندازہ فرماتا ہے، اس کو یہ بھی معلوم ہے کہ تم ان اوقاتِ عبادت کو نباہ نہیں سکتے، پس اس نے تم پر سے اس قدر شدید عبادت اٹھا دی، یہ ضروری نہیں کہ تم آدھی آدھی رات اور تین تین پہر تک خدا کے حضور کھڑے رہو، یوں

سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ فَاقْرَءُوْا
مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ ۙ وَاَقِيْمُوا
الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ
وَاَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا
حَسَنًا ؕ وَمَا تُقَدِّمُوْا
لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ
تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ
خَيْرًا وَّاَعْظَمَ اَجْرًا ؕ وَ
اسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ
غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

(۷۳:۲۰)

کرو کہ جس قدر بھی آسانی کے ساتھ رات کے نوافل میں قرآن پڑھ سکو، پڑھ لیا کرو، خدا کو معلوم ہے کہ تم میں بعض عبادت گزار ایسے ضعیف الجسم ہیں، کہ اگر آدھی آدھی رات تک اسی طرح عبادت کریں گے تو بیمار ہو جائیں گے، اور خدا کا عبادت سے یہ مقصود نہیں، وہ جانتا ہے کہ کچھ لوگ ان میں ایسے ہوں گے جو تجارت اور کسبِ رزق نیز حصولِ فوائد و نعائم کی تلاش میں سفر کریں گے اور یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ سفر کی حالت میں ایسی شدید عبادت کو بھی جاری رکھیں، نیز وہ خبردار ہے کہ ان میں بعض لوگ حق و صداقت کے لیے دشمنانِ اسلام سے لڑتے ہیں، اُن کے شب و روز زیادہ تر اسی میں بسر ہوں گے، پس چاہیے کہ راتوں کو وقت کی قید اٹھا دو، جس قدر آسانی سے ہو سکے، قرآن کو نماز میں پڑھو اور صلوٰۃِ الٰہی کو قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو، اپنے مال و دولت کو خدا کی راہ میں لٹاؤ، گویا اللہ کو قرضِ حسنہ دینا ہے، جس کا بدلہ اس کے خزانے سے دونوں جہانوں میں پاؤ گے۔"

اللہ اللہ! وہ کیا لوگ تھے، جن کے اعمال کی یہ تصویر و تقسیم تھی، اور وہ کیسی پاک روحیں تھیں، جن کی جاں نثاریوں اور عبادت گزاریوں کا حال ایک عاشقانہ محبت و شفقت کے لہجہ میں خود خدائے تعالیٰ نے فرمایا اور ان کے ذکر باقی کو صفحاتِ کلام اللہ میں ہمیشہ کے لیے

ثبت کر دیا۔ !

بہر حال اس آیت کریمہ میں ضمناً قرآن حکیم نے خود ہی بتلا دیا ہے کہ صحابہ کرام کی راہ عمل مختلف تھی، فرمایا کہ بعض فضلِ الٰہی کی تلاش میں سیر و سیاحت کرتے ہیں، اور بعض جہاد فی سبیل اللہ کی راہ میں نکلتے ہیں، پھر کیوں آپ اس روایت میں لفظ "اختلاف" کا بھی مطلب نہ قرار دیں، کہ ان کا طریق کار حسبِ اصولِ تقسیم عمل مختلف تھا، اور یہ اختلاف قطعاً "رحمت" ہے اور ایسی رحمت عظیم کہ اگر نہ ہو تو دنیا کے عمران و تمدن کی بنیادیں ہل جائیں۔

اس سے بھی ایک دو قدم اور آگے بڑھیے اور دیکھیے کہ عزائم و رخص کے لحاظ سے بھی فی الحقیقت صحابہ کرام کی راہیں مختلف تھیں، اور ان میں باہم اختلاف تھا، حضرت ابوذرؓ زہد و نسک میں منہمک تھے، حضرت عثمان بن مظعونؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ پر استغراق عبادت و ترک لذائذِ دنیوی کا غلبہ تھا، حضرت ابنِ کعبؓ، ابن مسعودؓ، ابن عباسؓ حفظ و درس علوم پر زیادہ وقت صرف کرتے تھے، مگر حضرت عثمان بن عفانؓ نے کسب و تجارت پر اوروں سے زیادہ توجہ دی ____ پس اگر صحابہؓ میں یہ اختلاف نہ ہوتا اور سب کے سب مثل حضرت ابوذرؓ اور ابن مظعونؓ کے زہد و ترکِ لذائذ میں مستغرق ہو جاتے، تو نتیجہ یہ نکلتا کہ ان کا نمونہ امتِ مسلمہ میں آگے چل کر وہ غلو اور حرج پیدا کر دیتا جو اہل کتاب کے رہبان میں پیدا ہوا اور جس کو اسلام نے دور کیا ورھبانیۃ ابتدعوھا۔ لیکن اگر سب کے سب مثل امیر معاویہؓ اور عمرو بن العاصؓ کے دہاءِ سیاست اور محبت نعم و زینت و ریاست میں منہمک ہو جاتے تو تمام امت محض مادیت و جسمانیت ہی میں غرق ہو جاتی، اور روحانی لذتوں کا کوئی بھوکا نہ رہتا۔

یہ جو کچھ عرض کیا گیا، یقین کیجیے کہ قرآن حکیم ہی کی بخشی ہوئی روشنی ہے اور اپنی راہ بھی ہے کہ ہر روشنی جو آنکھ دیکھے، اُس کا اکتسابِ نور اسی آفتابِ ہدایت سے کیا جائے، خود ہی زیرِ بحث روایت بتلاتی ہے کہ سب سے پہلے کتاب اللہ سے اخذ فیضان کرو اور اس لیے ہر روایت کو بھی سب سے پہلے کتاب اللہ پر عرض کرنا چاہیے، اختلاف کی نوعیت کے متعلق "سورہ مزمل" کی آیات اوپر گزر چکی ہیں۔ اب ایک اور آیت آخر سورہ "توبہ" کی تلاوت کیجیے:

"وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ"

(۱۲۲:۹)

"سارے مسلمان تو اسی کام کے لیے ہو کر نہیں نکل سکتے ہیں، کیوں نہ ایسا ہو کہ ہر جماعت میں سے ایک گروہ اس غرض سے نکلے کہ دین کے علم و احکام کو حاصل کرے اور دین کا مبلغ و داعی بن کر اپنی قوم میں واپس جائے، اور باطل پرستی کے نتائج سے اس کو ڈرائے"۔

اس آیت کریمہ میں بتلایا ہے کہ سب لوگ خدمتِ دین کی ایک ہی شاخ نہیں ہو جا سکتے تقسیم عمل کا قدرتی طریقہ اختیار کرنا چاہیے کہ ہر جماعت میں سے ایک گروہ اپنے اپنے حلقوں میں تبلیغ دین کا کام اپنے ذمہ لے لے، اور اپنے وقت کو حصول علم دین میں خرچ کرے، پس یہی اختلاف صحابہؓ کے مختلف گروہوں کا تھا، جو امت کے لیے رحمت ہوا۔ اور یہی رحمت ہے جس سے اب ہم محروم ہیں۔"

("البلاغ" ۴ مئی ۵ ص ۱ تا ص ۴)

ایک عظیم و مقدس فن :

مولوی محمد علی صاحب خطیب مسجد بھاؤنگر نے مولانا آزادؒ سے بعض احادیث مشہورہ مندرجہ "احیاء العلوم" کی صحت و عدم صحت کے متعلق استفسار کیا تھا، مولانا نے اس کے جواب میں "الہلال" جلد چہارم میں نہایت ہی وضاحت اور تفصیل سے ہر فن کے عالم اور مصنف کی حیثیت علمی کے دائرہ پر روشنی ڈال کر تحریر فرمایا کہ حجۃ الاسلام امام غزالیؒ کی کتاب "احیاء العلوم"، بلاشبہ، علم اسرارِ دین میں عظیم و جلیل کتاب ہے، لیکن اس میں مندرج اکثر احادیث موضوع اور ضعیف ہیں، اس سلسلہ میں علامہ ابن تیمیہؒ وغیرہ ائمہ و محدثین کے اقوال نقل کر کے مزید صراحت کی، کہ امام غزالیؒ فلسفہ و کلام کے ماہر، تصوف و سلوک کے سب سے بڑے ترجمان ضرور ہیں، لیکن وہ محدث نہیں ہیں، اس کے بعد مولانا نے اصل مسئلے کی طرف توجہ فرمائی اور احادیثِ مسئولہ پر تحقیقی روشنی ڈالی۔ فرماتے ہیں :

"احادیث کی صحت و عدمِ صحت کا معاملہ بہت نازک اور محتاج علم و نظر ہے

جب تک اس فن عظیم ومقدس سے واقفیت نہ ہو اور تمام علوم متعلقۂ حدیث پر نظر نہ ہو، نیز تمام کتب معتبرۂ فوم وطبقات محدثین و ردات پیش نظر، و تصریحات ائمۂ فن وطرق تخریج ونقد و درایت کی پوری پوری من الباب الی المحراب خبر نہ ہو، اس وقت تک کچھ پتہ نہیں چلتا، محض چند کتب حدیث کا سامنے رکھ لینا اس بارے میں مفید نہیں۔"

احادیث مسئولہ عنہا :

اب میں فرداً فرداً آپ کی تحقیق طلب احادیث کی نسبت عرض کرتا ہوں :

(۱) "حب الدنیا رأس کل خطیئۃ"

یعنی دنیا کی محبت تمام خطاؤں کی جڑ ہے ــــ بیہقی نے "شعب الایمان" میں حسن بصری "سے روایت کی ہے ــــ ابونعیم "حلیۃ الاولیاء" میں اسے حضرت عیسٰی علیہ السلام کا قول کہتے ہیں (حلیہ ترجمۂ ابوسفیان) مالک بن دینار کی طرف بھی منسوب ہے۔ علامہ ابن تیمیہ نے اسے "جندب البجلی" کا قول کہا ہے۔ بہرحال یہ جملہ معناً تو بالکل صحیح ہے مگر لفظاً حدیث نہیں ہے۔

(۲) ماوسعنی ارضی ولا سمائی ولکن وسعنی قلب عبدی المؤمن"
یعنی خدا کہتا ہے کہ نہ تو مجھے زمین اٹھا سکی، نہ آسمان، مگر میرے مومن بندے کے دل ہی میں سما گیا۔ ــــ

در دل مومن بگنجم اے عجب
گر مرا جوئی دراں دلہا طلب

معناً یہ جملہ بہت صحیح اور قرآن کریم کی اس آیت کا بیان ہے :

"انا عرضنا الامانۃ علی السموات والارض والجبال فابین ان یحملنھا واشفقن منھا وحملھا الانسان"

لیکن حدیث نہیں ہے۔ محدثین نے تو اسے "اسرائیلیات" میں سے شمار کیا ہے۔

(۳) "گوشت کو چھری سے کاٹ کر کھانے کی ممانعت" ــــ غالباً آپ کا مقصود اس حدیث سے ہوگا : لا تقطعوا اللحم بالسکین فانہ من صنع الاعاجم"،
یعنی گوشت کو چھری سے کاٹ کر نہ کھاؤ۔ کیونکہ یہ عجمیوں کی ایجاد ہے ــــ۔

بیہقیؒ نے "شعب الایمان" میں اسے روایت کیا ہے۔ نیز ابوداؤدؒ نے "سنن" میں۔ لیکن امام شوکانیؒ لکھتے ہیں :

"قال احمد لیس بصحیح وقد کان النبی یحتزمن لحم الشاۃ"

(امام احمد کہتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح نہیں ہے، کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بکری کا گوشت کاٹنا ثابت ہے۔)

پھر اس روایت میں "ابومعشر" ہے اور امام کہتے کہ "لیس بشیئ" وہ کوئی چیز نہیں۔

(۴) "العلم علمان۔ علم الابدان وعلم الادیان" علم دو ہیں، ایک وہ علم جس سے بدنِ انسانی کا تعلق ہے یعنی "فن طب" اور ایک وہ جو شریعتوں اور دینوں کا علم ہے۔

اس کی بھی کوئی اصلیت نہیں۔ ضعیف سے ضعیف سند سے بھی کسی نے روایت نہیں کی۔ تعجب ہے کہ کیوں کر یہ جملہ حدیث مشہور ہوگیا۔

(۵) "رجب خدا کا مہینہ ہے اور شعبان پیغمبر کا، اور رمضان میری امت کا مہینہ ہے"۔

فضائلِ ایام وشہور میں موضوعات کا بڑا ذخیرہ ہے، غالباً آپ کا مقصد اس حدیث ہوگا : "رجب شھر اللہ وشعبان شھری۔ ورمضان شھر امتی، فمن صام فی رجب یومین فلہ من الاجر ضعفان الخ" لیکن محققین و ثقاتِ فن نے اسے موضوع قرار دیا ہے۔ اس کے اسناد میں "ابوبکر بن الحسن النقاش" ہے، جو متہم ہے۔ اور "کسائی" نامی بھی ایک راوی ہے، جو مجہول ہے۔

(۶) "صلوٰۃ التسبیح" سے مقصود ایک خاص نمازِ نفل ہے، جو چار رکعتوں میں ختم ہوتی ہے، ہر رکعت میں فاتحہ اور سورۃ کے بعد "سبحان اللہ والحمد للہ ولا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر" پندرہ مرتبہ پڑھتے ہیں، پھر رکوع اور قومہ اور دونوں سجدوں میں بھی دس دس مرتبہ یہی کلمات پڑھے جاتے ہیں، اس طرح ہر رکعت میں ۷۵ مرتبہ کلمہ تسبیح پڑھا جاتا ہے۔

اس نماز کے متعلق متعدد طرق سے حدیث مروی ہے۔ سب سے زیادہ مشہور دو طریقے ہیں :

ایک حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے۔ دوسرا حضرت ابورافعؓ کی روایت سے۔

پہلی روایت کو ابوداؤدؒ، ابن ماجہؒ اور حاکمؒ نے درج کیا ہے ۔ دوسری ترمذیؒ اور ابن ماجہؒ میں ہے ۔ دارقطنیؒ نے بھی حضرت عباسؓ سے مرفوعاً روایت کیا ہے۔

لیکن اس حدیث کے متعلق محققین فن میں اختلاف ہے۔ محدث ابن جوزیؒ نے موضوعات میں شمار کیا ہے۔ حافظ ابن حجرؒ اس کا رد کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ "ابن عباسؓ والی روایت مضبوط اور شرط حسن پر ہے۔ نیز ابن داؤدؒ نے اسے" لاباس بہ "سے روایت کیا ہے، اور "فضل بن عباسؓ، ابن عمرؓ، علیؓ ابن ابی طالب، جعفرؓ بن ابی طالب، ام سلمہؓ ان سب سے روایتیں موجود ہیں، ایسی حالت میں "ابن جوزی" کا موضوع کہنا کس قدر زیادتی کی بات ہے؟ چنانچہ لکھتا ہے: "وقد اساء ابن الجوزی بذکرہ فی الموضوعات"۔

علاوہ حافظ ابن حجرؒ کے "ابن مندہؒ"، "خطیبؒ"، "ابن الصلاحؒ" اور "نوویؒ" نے بھی صحیح یا حسن قرار دیا ہے اور اس کی تصویب کی ہے، تاہم ایک بڑی جماعت محدثین کی اسے ضعیف بھی کہتی ہے۔ اور "موضوع" کہنے والوں میں "ابن جوزیؒ" کے علاوہ "عقیلیؒ" بھی ہیں:

"وقال العقیلی: لیس فی صلوۃ التسبیح حدیث یثبت، وقال ابن العربی لیس فیہا حدیث صحیح ولا حسن" (الفوائد المجموعہ للشوکانی)

اور عقیلیؒ نے کہا کہ صلوٰۃ تسبیح کے بارے میں کوئی حدیث ثابت نہیں۔ نیز ابن عربیؒ کہتے ہیں کہ اس بارے میں نہ تو کوئی حدیث صحیح مروی ہے اور نہ حسن۔

حتیٰ کہ حافظ سیوطیؒ "اللآلی" میں لکھتے ہیں:

"والحق ان طرقہ کلہا ضعیفۃ وان حدیث ابن عباس یقرب من شرط الحسن الا انہ شاذ لشدۃ الفردیۃ وعدم المتابع والشاہد من وجہ معتبر، ومخالفۃ ہیئتہا لہیئۃ باقی الصلوۃ"۔

اور حق یہ ہے کہ اس حدیث کے تمام طریقے ضعیف ہیں، ابن عباسؓ والی حدیث البتہ "شرط حسن" کے قریب پہنچتی ہے، مگر اس میں بھی یہ کمی ہے کہ "شاذ" ہے، کیونکہ کمال درجہ اپنے بیان میں فرد ہے اور اس کا تابع اور شاہد کوئی نہیں جو کوئی وجہ معتبر رکھتا ہو، نیز یہ بات بھی ہے کہ جس نماز کی اس میں ترکیب بتائی گئی ہے، اس کی صورت باقی نمازوں کے مخالف ہے

حافظ موصوف کا قول اس حدیث کے لیے سب سے بہتر اور معتدل قول فیصل ہے۔ اسی سے آپ رائے قائم کرلیں ــــ رہا "صلوٰۃ تسبیح" کا حکم اور فضائل، تو وہ بہرحال ایک نفل نماز ہے اور اس طریق تسبیح سے عبادت کرنا کسی دوسری نص کا معارض بھی نہیں، مختصر یہ کہ اس پر عمل کرنا قابل اعتراض نہیں ہوسکتا ــــ وھذا ھو الحق عندی۔

بعض دیگر موضوعات مشہورہ

(۷) "حب الوطن من الایمان"، محبت وطن کی، ایمان میں سے ہے۔

یہ ایک اچھا اور صحیح جملہ ہے، مگر اسے حدیث کہنا بالکل کذب و افتراء ہے، کسی غیر معروف سند سے بھی مروی نہیں۔

(۸) "علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل" میری امت کے علماء ایسے ہیں جیسے بنی اسرائیل کے نبی ــــ

بالکل بے اصل ہے۔ حافظ ابن حجرؒ نے صاف لکھ دیا ہے کہ "لا اصل لہ" البتہ "العلماء ورثۃ الانبیاء"، کو "احمدؒ"، "ابوداؤدؒ" اور "ترمذیؒ" نے روایت کیا ہے"۔

("الہلال" جلد چہارم ۶ رمئی ۱۹۱۴ء)

موضوع نہایت درجہ دلکش اور اثر آفریں ہے، نیز احادیث کی بصیرت افروز تشریحات بھی حد شمار سے زیادہ ہیں، لیکن حیران ہوں کہ ان دُرِ بے بہا کو سلکِ تحریر میں کس طرح منسلک کروں، جب کہ ہر تشریح تفصیلی توجہ کی طالب ہے؟ ــــ مگر اختصار کا تقاضا عنانِ قلم کو کھینچ رہا ہے، لیکن جی چاہتا ہے اور بے اختیار چاہتا ہے کہ صحیح بخاری شریف سے متعلق حقائق و معارف کے عطر میں ڈوبے ہوئے اقتباس، اصحاب بینش و دانش کے نظر و مطالعہ کے لیے پیش کردوں۔

صحیح بخاری:

مولانا آزادؒ نے "مسلم انسٹی ٹیوٹ ہال۔ کلکتہ" میں مولانا شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کی رحلت کے بعد ایک جلسہ میں، ان کی حیات علمی و ادبی پر نہایت جلیل القدر اور سیر حاصل تقریر فرمائی تھی؛ اس میں فن تصنیف و تالیف کا تذکرہ کرتے ہوئے تصنیفات کی بلحاظ موضوع و مقاصد مختلف قسمیں قرار دی تھیں۔ بہر قدماء اور متاخرین کے ادوار اور ان کی "خصوصیات تحریر و تدوین" کو

مثالوں سے سمجھاتے ہوئے قدمائے مصنفین کو متأخرین پر ترجیح دی تھی۔ اسی سلسلۂ بیان میں مولانا نے صحیح بخاری کو فن تصنیف و تالیف کے لحاظ سے تاریخ اسلام کی تمام مدوّنہ کتب میں بہترین کتاب قرار دیا ۔ چنانچہ ملاحظہ فرمائیے ۔ فرماتے ہیں :

"نہ صرف عظمتِ موضوع و تقدسِ مضمون کے لحاظ سے بلکہ طرز تصنیف و ترتیب، ضبطِ مطالب اور حسن تقسیم و تنظیم کے لحاظ سے بھی تمام تاریخ اسلام میں بہترین کتاب "صحیح بخاری" لکھی گئی ہے، اور کوئی اسلامی تصنیف اس تک نہیں پہنچ سکتی۔ "امام بخاریؒ" کے بعد بقیہ اصحاب صحاح و جامعین سنن و معاجم و مسانید نے نئے نئے اسلوب مطالب پیدا کیے، مگر کوئی کتاب صحیح بخاری تک نہ پہنچ سکی۔

اور یہ میں محض فن حدیث کی قدیم خوش اعتقادیوں کی بنا پر نہیں کہہ رہا ہوں، بلکہ یقین کیجیے کہ اُس "فن تصنیف" کو پیش نظر رکھ کر جو ترقی یافتہ علمی زبانوں میں آج پایا جاتا ہے، میں نے علی وجه البصيرة ۔ یہ رائے قائم کی ہے۔"

("البلاغ" ۷ ار ۲۴ ر دسمبر ۱۹۱۵ء صفحہ ۸)

بخاری شریف کے عجائب و دقائق :

"بخاری شریف" کے عجائب و دقائق اور اس کے ابواب و تراجم کی معنی آفرینیوں سے عرفائے حدیث اور جوہر شناسانِ فن حدیث بخوبی واقف ہیں، لیکن درج ذیل ایمان پرور اقتباس ملاحظہ فرمائیے۔ آپ بے اختیار داد دینے پر مجبور ہوں گے کہ مولانا آزادؒ نے "بخاری شریف" کے ابواب و تراجم سے، اسلام کے نظام شرعی کو کس لطیف پیرایہ میں نہایت خوبی و کمال سے ثابت کیا ہے۔ فرماتے ہیں :-

"حق یہ ہے کہ بقول علامہ ابن خلدونؒ "صحیح بخاری شریف" کی شرح و تفسیر کا فرض اب تک امت کے ذمہ باقی ہے، بے شمار شرحوں اور حاشیوں کے بعد بھی اب تک ابن خلدونؒ کا قول ویسا ہی صحیح ہے، جیسا "فتح الباری" اور "عینی" وغیرہ سے پہلے تھا۔

اس کتاب کے عجائب و دقائق قیامت تک ختم نہ ہوں گے۔ ہر کتاب۔ ہر باب۔ ابواب کی ترتیب اور ہر ہر عنوان و ترجمہ، اس فقیه الارض اور اعجوبة الدهر کی فقاہت

ربانی کی ایک "آیتِ قاہرہ" و "حجت باہرہ" ہے۔ اسی مسئلہ خلافت کو سامنے لاؤ اور دیکھو، کس دقت نظر کے ساتھ محض ترتیبِ ابواب ہی میں اسلام کا "نظام شرعی" واضح کر دیا ہے، اور ساری مشکلات حل کر دی ہیں۔

سب سے پہلے بات یہ تھی کہ اسلام کا "نظام مرکزیت" اس بارے میں کیا ہے؟ —— تو پہلا باب "اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم" کا باندھا — اور "من اطاع امیری فقد اطاعنی" الخ کی روایت درج کر کے بتلا دیا کہ مرکز "کتاب اللہ" ہے "رسول" ہے اور پھر "خلیفہ و امام" ہے "اولوا الامر" خلیفہ کے سوا کوئی نہیں، اس کی اطاعت (بشرطیکہ کوئی خلافِ شرع حکم نہ ہو) مثل خدا و رسولؐ کی اطاعت کے فرض ہے — پھر باب باندھا الامراء من قریش — اس میں "ابن جبیر" والی روایت لائے "ما اقاموا الدین" جب تک قریش دین کے قائم رکھنے کی اہلیت رکھیں گے۔ خلافت ان ہی میں رہے گی۔ اس طرح واضح کر دیا کہ ایک خاص مدت تک "قریشی خلافت" کی پہلے سے خبر دے دی گئی تھی، مگر خلیفہ کا قرشی ہونا کوئی شرطِ اصلی و تشریعی نہیں ہے۔ صرف پیشین گوئی اور ہونے والے واقعات کا بتلا دینا ہے، جیسا کہ بے شمار معاملات کی نسبت خبریں دی گئی ہیں، اور پھر جو کچھ بھی ہے "ما اقاموا الدین" کے ساتھ مشروط ہے — اس کے بعد ایک نہایت ہی اہم اور دقیق نکتہ کی طرف متوجہ ہوئے اور باب باندھا اجر من قضیٰ بالحکمۃ افسوس ! اس باب کے ربط و ترتیب کی اصلی علت لوگ نہ سمجھے، منصبِ خلافت کے اثبات کے بعد یہ چیز سامنے آتی تھی کہ اعمالِ خلافت کی بنیاد کیا ہے ؟ اور اس کا طریق کس منہاج سے ماخوذ ہے ؟ ۔

امام صاحبؒ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ بنیاد اس کی طریق "حکمت" پر ہے، یعنی انبیاء کرام کے طریقِ تربیت امم پر جو "سنت" کا اصلی اور وسیع مفہوم ہے اور قرآن حکیم کی اصطلاح میں "حکمت" سنت نبوت ہی کا دوسرا نام ہے۔ ترجمۂ باب میں اس پر قرآن سے دلیل بھی لائے۔ "وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ"۔ حکم و قضا "مَا أَنزَلَ اللَّهُ" کے مطابق ہونا چاہیے، اگر خلاف ہو تو فسق ہے۔ "مَا أَنزَلَ اللَّهُ" کتاب و سنت ہے "وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ" پس ثابت ہوا کہ "اعمالِ خلافت کی

بنیاد حکمت و منہاجِ نبوت پر ہونی چاہیے، اس بارے میں جو زیادہ واضح اور مفصل احادیث تھیں چوں کہ ان کی شروط کے مطابق نہیں لی جا سکتی تھیں اور بنیاد استدلال کی طرف مرفوع ہی پر رکھتے ہیں، اس لیے آثار و موقوفات بھی نہیں لے سکتے تھے، پس مشہور حدیث لَا حَسَدَ اِلَّا فِي اثْنَتَيْنِ الخ درج کر کے "قضاء بالحکمۃ" کی اہمیت واضح کر دی، جب یہ مقدمات طے ہو چکے تو اب دکھلانا تھا، کہ اس مرکز کی اطاعت کس طرح امت پر فرض کر دی گئی ہے؟ پس باب باندھا "اَلسَّمْعُ وَالطَّاعَةُ لِلْإِمَامِ مَا لَمْ تَكُنْ مَعْصِيَةً" امت کا سننا اور اطاعت کرنا امام کے حقوق میں سے ہے، بجز اس حکم کے کہ معصیت ہو۔ اس میں وہ تمام حدیثیں لائے ہیں جن میں صریح حکم موجود ہے کہ خلیفہ اہل ہو یا نا اہل — جامع الشروط ہو یا فاقد الشروط، عادل ہو یا جابر، مکروہات کا حکم دے یا محبوبات کا، جب تک وہ مسلمان ہے نماز قائم رکھتا ہے، اس کی اطاعت کرنی چاہیے، کسی مسلمان کے لیے اس کی اطاعت سے باہر ہونا جائز نہیں۔

اس کے بعد بالترتیب تین باب لائے ہیں: پہلا "من لم یسأل الامارۃ اعانہ اللہ"، دوسرا: "من سأل الامارۃ وکل الیہا"، تیسرا: "ما یکرہ من الحرص علی الامارۃ" حاصل ان تینوں عنوانوں کا یہ ہے کہ جہاں شارعؑ نے امت کو خلیفہ و امام کی ضروری صفتیں اور شرطیں بتلا دی ہیں، وہاں اس سے بھی رد کر دیا ہے، کہ کوئی شخص خود امامت و سرداری کا خواہاں ہو، اور اس کے لیے کوشش کرے، حتیٰ کہ "عبدالرحمٰن بن سمرہؓ سے کہا کہ" جو اہل اور احق ہو، اسی کا ساتھ دو، خود اپنے لیے خواہاں نہ ہو۔ اگرچہ اس کے لیے قسم توڑنی اور کفارہ بھی دینا پڑے"۔ پس ان تمام ابواب کی یکے بعد دیگرے ترتیب سے واضح ہو گیا کہ اس بارے میں "نظام شرعی" کی قدرتی ترتیب یہ ہے:

۱۔ امت کے لیے حسب نص "واولی الامر منکم" مرکز اجتماع و جماعت خلیفہ کا وجود ہے، اس کی اطاعت فرض ہے۔

۲۔ خبر دے دی گئی تھی کہ جب تک عرب و قریش میں صلاحیت رہے گی، خلافت پر قابض رہیں گے، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

۳۔ بنیاد معاملۂ خلافت کی "حکمت" پر ہے وہ "حکمت" کہ "ویعلمھم الکتاب و

الحمکتہ یہ نیابت نبوت ہے اور اعمال سنت و نبوت ہی کا نام قرآن کی اصطلاح میں "حکمت" ہے، پس ضروری ہے کہ خلیفہ کے تمام کاموں کی بنیاد طریق سنت پر ہو، بدعت و احداث پر نہ ہو — یہی معنی "منہاج نبوت" کے ہیں۔

(۴) جب خلافت منعقد ہوگئی تو تمام امت پر اس کی اطاعت فرض ہے "فی ما یحب ویکرہ ما لم یؤمر بمعصیۃ"

(۵) امت کو چاہیے کہ احق و اہل کو منتخب کرے، لیکن مستحق کو نہ چاہیے کہ خود خلافت کی خواہش کرے جس نے ایسا کیا، اللہ کے حضور شرمندگی پائے گا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جب لوگ خود خواہش نہ کریں گے اور حق انتخاب جمہور کو ہے تو کسی طرح کی بھی کشمکش نہ ہوگی، نہ بہت سے دعویداروں میں باہم جھگڑا ہوگا، امن و سکون کے ساتھ یہ معاملہ انجام پا جائے گا۔

یہ تھا صحیح "نظامِ شرعی" جس کے علم و فہم کے لیے صرف "صحیح بخاری" ہی کافی ہے اور اسلام کی کونسی حقیقت ہے جس کے لیے "صحیح بخاری" کافی نہیں؟"

("مسئلہ خلافت و جزیرۃ العرب" ص ۳۶، ۳۷، ۳۸، ۳۹ مطبوعہ کلکتہ ۱۹۲۰ء)

گذشتہ اوراق میں جو کچھ سپرد قلم ہوا ہے، وہ محض اشارات ہیں، لیکن ان اشارات سے بھی یہ حقیقت آشکارا ہوگئی کہ بصیرت کی روشنی، نظر کی بلندی، فہم کی گہرائی، علم کی وسعت، احادیث و آثار کے احاطہ و رسوخ اور استنباط و استدلال کی قدرت کے لحاظ سے مولانا آزادؒ دیگر علوم و فنون کی طرح، فن حدیث کے بھی لاریب امام ہیں اور رب بدیع فیاض نے انہیں اپنے فیوض و برکات سے بہرۂ وافر عطا فرمایا ہے۔ یہی وجہ ہے، ان کی تحریریں، مذہبی ہوں یا علمی:

★ قرآن و حدیث کے انوار و تجلیات سے روشن ہو کر رعنائی بوقلموں کے ساتھ نظر افروز اور بصیرت فرما ہوتی ہیں۔

★ ان میں علوم و معارف کے کنوز اور حقائق و دقائق کے خزائن دفن ہیں، تو حکمت و موعظت کی کائنات بھی بسی ہوتی ہے۔

★ ان میں محبت خالق اور عشق رسول کی طلائی و نقرئی جدولیں بھی نہایت ایمان افروز قوت کے ساتھ رواں دواں ہوتی ہیں۔

★ لفظ لفظ میں کمال اخلاص کی نمود ہوتی ہے، تو جمالِ تقویٰ کا ظہور بھی بدرجۂ تمام جلوہ بیز ہوتا ہے۔

★ رقت، خشیتِ الٰہی اور سوز و گداز، سوادِ حروف کے اندر اس انداز سے حلول کر گیا ہے کہ پڑھتے وقت محسوس ہوتا ہے، مولاناؒ نے اپنے دل کی قاشیں اور جگر کے ٹکڑے پیوست عبارت کر دیے ہیں۔

★ ایک ایک فقرے ایک ایک جملے اور ایک سطر میں اعجاز اور اثر ایسا سرایت کر گیا ہے، جیسے روحِ نکہت پھول کی حسین پنکھڑیوں میں جذب ہو گئی۔

★ لیکن ادب و انشاء کے چمنستان ہزار رنگ میں ان کے گوہر نگار قلم نے ایسے وجد آفریں انداز میں گہر افشانی کی ہے کہ نکتہ سنجانِ علم و ادب جھوم جھوم اٹھتے ہیں اور یہ محسوس کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ مولانا کی تحریر کا ایک ایک لفظ گلاب کی طرح شاداب، پھول کی طرح عطر بیز اور سورج کی طرح روشن اور چمکدار ہے۔ استعارات، تشبیہات اور تمثیلات کی دل فریبیوں اور حسن افروزیوں کے ساتھ مطالب و مفاہیم کی لطافت و حلاوت کا بھی ایسا دل آویز اختلاط ہے، جیسے قوسِ قزح کے رنگ باہم دگر بغل گیر ہو گئے ہیں۔

غرضیکہ اس صاحب علم و فضل کے کمالاتِ ذہن و فکر اور اس کے مطالعہ و نظر کی وسعتوں، جمالِ حقائق کی دلربائیوں اور تحریر و انشا کی دل آویزیوں کا کہاں تک ذکر کیا جائے! اگر پیش نظر ایک جامع تصنیف نہ ہو تو ایک مقالے کی زیادہ سے زیادہ گنجائش جس کا تصور کیا جا سکتا تھا، اختتام کو پہنچ رہی ہے اور اس باب میں جو کچھ کہنا چاہیے تھا، وہ باقی ہے۔ اس لیے زبانِ قلم مجبور ہے کہ جو کچھ اُس نے عرض کیا ہے۔ اسی پر اکتفاء کرے ؎

زباں ز نطق فرو ماند و رازِ من باقی ست
بضاعتِ سخن آخر شد و سخن باقی ست

افاداتِ آزاد

مذہبی اور ادبی استفسارات کے جوابات

مولانا ابوالکلام آزاد

کے قلم سے اور اُن کی جانب سے

مولانا کے علمی تبحر دینی بصیرت، مجتہدانہ نظر اور تفقہ فی الدین کے شاہکار ملفوظات و جوابات

حصۂ اوّل (دینی)

ایمان و عقائد، عبادات، نکاح و طلاق، قرآن و حدیث، فقہ، مسائلِ جدیدہ، تصوف، تعلیم و اصلاح، رسوم، قادیانیت وغیرہ عنوانات کے ذیل میں سینکڑوں مسائل کے متعلق محققانہ، فکر انگیز اور ایمان پرور ملفوظات و جوابات

حصۂ دوم (ادبی)

ادب، تاریخ، فلسفہ، تہذیب، ثقافت اور بہت سے مسائل و افکار اور شخصیات و موضوعات کے بارے میں مولانا آزاد کے تین سو سے زیادہ نہایت معلومات افزا اور بصیرت افروز جوابات

مولانا ابوالکلام آزاد کے نادر افادات کا یہ مجموعہ

ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری کے ذوقِ تحقیق کا نتیجہ اور حسنِ ترتیب و تدوین کا نمونہ ہے

اس مجموعۂ افادات کی تصحیح مولانا غلام رسول مہر نے فرمائی ہے

اور

اس پر ایک عالمانہ و ادیبانہ مقدمہ مولانا آزاد کے پرائیویٹ سیکرٹری محمد اجمل خان کے قلم سے!

سفید کاغذ — آفسٹ کی چھپائی — قیمت ۲۵ روپے

ادارۂ تصنیف و تحقیق پاکستان، الحیدری ۱۸۰۸۶ کراچی ۳۳

اردو کے معتبر دادا ہیرو ابو ظفر الحسن مرحوم کی یاد میں
یہ کتاب کتب خانہ ادارہ ادبیات اردو
حیدرآباد دکن کو پیش کی جاتی ہے

مجلس ادبیات مشرق

۲ ڈی - ۹/۲۶ - ناظم آباد - کراچی

۴

مولانا ابوالکلام آزادؒ

(بہ حیثیت مفسر و محدث)

ادارہ
تصنیف و تحقیق
پاکستان
۱۸۰۸۶ کراچی ۲۳

اِنَّ اللّٰہَ یَرْفَعُ بِھٰذَا الْکِتَابِ اَقْوَامًا وَّیَضَعُ بِہٖ اٰخَرِیْنَ

ترجمان القرآن

قرآن حکیم کے مطالب اردو زبان میں
ضروری تفسیر کے ساتھ

ابوالکلام احمد

مکتبہ مصطفائی کشمیری بازار لاہور

ترجمان القرآن

ھٰذَا بَصَائِرُ لِلنَّاسِ وَھُدًی وَّرَحْمَۃٌ لِّقَوْمٍ یُّوْقِنُوْنَ

البصائر

ایک ماہوار دینی و علمی مجلہ

اعلان پہلے "البیان" کے نام سے ادا کیا ہوا۔
وسط شوال سے شائع ہونا شروع ہو رہا ہے

القسم العربی

یعنی "البصائر" کا عربی ایڈیشن

مؤلفہ

ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری